ایک ایسی کتاب جسے کامیابی کے طلب گار
ہر انسان کو ضرور پڑھنا چاہیے
ناممکن سے ممکن کا سفر
!
باہمت اور کامیاب ترین لوگ جنہوں نے اپنی محرومیوں کو
متاثر کن صلاحیتوں میں بدل کر دنیا کو حیران کر دیا
عبدالعزیز چوہدری

# ناممکن سے ممکن کا سفر

عبدالعزیز چوہدری

نئی سوچ پبلشرز
آفس نمبر 46، 47 فرسٹ فلور، حاجیہ حلیمہ سنٹر، غزنی اسٹریٹ،
اردو بازار لاہور 042-37361416

☆ کتاب کا نام : ناممکن سے ممکن کا سفر

☆ مصنف : عبدالعزیز چوہدری

☆ زیر اہتمام : چوہدری کاشان طارق

☆ طابع : حاجی حنیف پرنٹرز

☆ اشاعت دوئم : نومبر 2018ء

☆ قیمت : 500روپے

Office # 46-47, 1st Floor Hadia Halima
Center, Ghazi Street, Urdu Bazar,
Lahore. 0300-8475843

# فہرست مضامین



| صفحہ | Name with Disability | نام | نمبر |
|---|---|---|---|
| 23 | Helen Keller (Deaf, Dumb & Blind) | ہیلن کیلر | 1 |
| 32 | Dr. Stephen Hawking (ALS) | ڈاکٹر سٹیفن ہاکنگ | 2 |
| 41 | Louis Braille (Blind) | لوئس بریل | 3 |
| 45 | Arunima Sinha (Amputee) | ارونما سنہا | 4 |
| 53 | Erik Weihenmayer (Blind) | ایرک ویہین مایر | 5 |
| 58 | Nick vujicic (Tetra-Amelia Syndrome) | نک وجلک | 6 |
| 63 | Saima Saleem (Blind) | صائمہ سلیم | 7 |
| 67 | Saima Ammar (Blind) | صائمہ عمار | 8 |
| 71 | Muneeba Mazari (Wheel Chair Bound ) | منیبہ مزاری | 9 |
| 78 | Dr. Farzana Sulman (Blind) | ڈاکٹر فرزانہ سلیمان | 10 |
| 81 | Dr. Aziza Sa'eed (Blind) | ڈاکٹر عزیزہ سعید | 11 |
| 84 | Dr. Shahida Rasool (Blind) | ڈاکٹر شاہدہ رسول | 12 |
| 88 | Dr. Sabir Michael (Blind) | ڈاکٹر صابر مائیکل | 13 |
| 92 | Syed Sardar Ahmad Peerzada (Blind) | سید سردار احمد پیرزادہ | 14 |
| 96 | Amar Khan (Wheel Chair Bound) | امر خان | 15 |
| 100 | Sulman Arshad (Blind) | سلیمان ارشد | 16 |
| 104 | RJ.Mohsin Nawaz (Blind & Polio) | محسن نواز | 17 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 107 | Dr. Anum Najam (Wheel Chair Bound ) | ڈاکٹر انعم نجم | 18 |
| 113 | Rana Taab Irfani (Blind) | رانا تاب عرفانی | 19 |
| 117 | Farzana Kousar (Bone Disease) | فرزانہ کوثر | 20 |
| 120 | Dr. Ameer Ali Majid (Blind) | ڈاکٹر امیر علی ماجد | 21 |
| 123 | Prof. Dr. S.M. Iqbal (Blind) | پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال | 22 |
| 126 | Dr. Salma Maqbool (Blind) | ڈاکٹر سلمیٰ مقبول | 23 |
| 129 | Nasima Herzik (Wheel Chair Bound) | نسیمہ ہرزق | 24 |
| 133 | Sabriya Tenberken (Blind) | صابریا ٹنبرکن | 25 |
| 138 | Terry Fox (Cancer & Amputee) | ٹیری فاکس | 26 |
| 142 | Jia Haixia & Jia Wenqi (Blind & Phy) | جیا ہائکسیا اور جیا وینکی | 27 |
| 145 | Fanny Crosby (Blind) | فینی کروسبائے | 28 |
| 149 | Stevie Wonder (Blind) | اسٹیوونڈر | 29 |
| 151 | Harriet Tubman (Visually Impaired) | ہیریٹ ٹیوب مین | 30 |
| 154 | Andrea Bocelli (Blind) | انڈریا بوسیلی | 31 |
| 157 | James Thurber (Blind) | جیمز تھربر | 32 |
| 160 | Brian McKeever (Blind) | برائن مِلکیور | 33 |
| 163 | Marla Runyan (Blind) | مارلا رنیان | 34 |
| 166 | Dr. Taha Hussain (Blind) | ڈاکٹر طٰہٰ حسین | 35 |
| 170 | Albert Einstein (Dyslexic) | البرٹ آئن سٹائن | 36 |
| 173 | Isaac Newton (Stutter & Epilepsy) | آئزک نیوٹن | 37 |
| 175 | Jhakmak Ghemeir (Cerebral Palsy) | جھکماک گھمیر | 38 |
| 178 | J.Pal Reddy (Physically Challanged) | جے پال ریڈی | 39 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 180 | SriKanth (Blind) | سری کانتھ | 40 |
| 183 | Abbey Curran (Cerebral Palsy) | ابے کیورن | 41 |
| 187 | Eli Reimer (Down Syndrome) | ایلی ریمر | 42 |
| 190 | Angela Bachiller (Down Syndrome) | انجیلا بچیلر | 43 |
| 192 | Pablo Pineda (Down Syndrome) | پابلو پینیڈا | 44 |
| 194 | Lauren Potter (Down Syndrome) | لورین پوٹر | 45 |
| 197 | Jamie Brewer (Down Syndrome) | جیمی بریور | 46 |
| 199 | Megan McCormick (Down Syndrome) | میگن میکومیک | 47 |
| 201 | Bryann Burgess (Down Syndrome) | براین برگن | 48 |
| 203 | Tim Harris (Down Syndrome) | ٹم حارث | 49 |
| 205 | Maryam Khan (Down Syndrome) | مریم خان | 50 |

# انتساب

اپنے شفیق والدین کی محبت

اور

استادمحترم سید قاسم علی شاہ کی بصیرت کے نام

# سید قاسم علی شاہ

"پرندہ پروں سے نہیں اُڑتا بلکہ یقین سے اُڑتا ہے"

یہ وہ تحریک پیدا کرنے والا جملہ ہے جو اس کتاب کی ہر کہانی کو پڑھنے کے بعد خیال میں آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز چوہدری کی تلاش جستجو اور شوق کا ثبوت یہ کتاب خود ہے۔ انہوں نے جس انتھک محنت سے یہ کتاب لکھی ہے کتاب کی اثر پذیری (تاثیر) بتاتی ہے کہ یہ غیر معمولی کام ہے۔ دنیا کا کوئی بھی لکھاری اگر اپنی تحریر کے ذریعے اپنے قاری میں اگر یہ یقین پیدا کر دیتا ہے کہ:

"تم کر سکتے ہو"

تو یہ لکھاری کا قاری پر احسان ہوتا ہے۔ کیونکہ یقین بہت بڑی دولت ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی کتاب یقین کی دولت سے مالا مال ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ بھی علم میں آیا کہ اپاہج ہاتھ، پاوں یا بازوں سے نہیں ہوتا بلکہ "سوچ" اپاہج ہو تو انسان کا سارا وجود اپاہج بن جاتا ہے۔

اللہ تعالی ڈاکٹر صاحب کی کوشش کو قبول کرے آمین۔

قاسم علی شاہ (مصنف، استاد، سپیکر)

# عاطف مرزا

''جرات ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے'' اس کتاب کی ہر کہانی دراصل ''بڑی سوچ'' کی کہانی ہے۔ یہ کتاب آپ کے اندر یہی بڑی سوچ پیدا کرتی ہے۔ کم وسائل کے باوجود آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ ہر چیلنج اور ہر مشکل کا سامنا کیا جا سکتا ہے۔ ہر معذوری کو شکست دی جا سکتی ہے۔ آپ جیسے ہی بے شمار لوگ کامیابی کی داستانیں رقم کر چکے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ اپنے اندر بڑی سوچ پیدا ہونے دیں۔ وہ سوچ جو آپ کو اپنی ذات سے اوپر لے جائے۔ جو آپ کو کسی مقصد مشن اور انسانوں کی خدمت کے جذبے سے جوڑ دے۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر عبدالعزیز کی یہ تحریر اُمید کی ایک تحریک بن جائے۔ آمین۔

عاطف مرزا (مصنف، ٹرینر، سپیکر)

# حافظ علی محسن

عبدالعزیز صاحب سے میرا تعلق گذشتہ 10 سال سے ہے۔ ان کی زندگی جہد مسلسل اور مشعل راہ ہے۔ جس تیزی سے انہوں نے کامیابیوں کو سمیٹا ہے وہ واقعی قابل ستائش ہے۔ یہ کتاب نہ صرف دنیا بھر کے خصوصی افراد کو خراج تحسین کے طور پر جانی جائے گی بلکہ یہ کتاب چوہدری صاحب کی شب وروز کی محنت اور لگن کی علامت بن کر رہے گی۔

میری خواہش ہے کہ یہ کتاب ہر گھر، دفتر اور لائبریری کی زینت بنے اور ہر طبقہ زندگی سے متعلقہ افراد اس سے استفادہ کریں اور اپنی زندگیوں میں کامیابی و کامرانی کی منازل طے کریں تاکہ ہمارے معاشرے میں برداشت، حوصلہ اور عزم وہمت کے جذبات میں اضافہ ہو اور معاشرتی ہم آہنگی پیدا ہو۔ آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالی عبدالعزیز چوہدری صاحب کی اس کاوش کو قبولیت عامہ عطا فرمائیں اور مزید تحقیقاتی وادبی کام کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

حافظ علی محسن (پرنسپل این۔ایس۔ای۔سی۔لاہور)

# ڈاکٹر محمد سعید

"تم تو ہو ہی نکمے" یہ جملہ اکثر بچوں کو غذا کے ایک لازمی جزو کے طور پر والدین کی طرف سے سننے کو ملتا ہے۔ والدین اپنی طرف سے یہ فیصلہ سنانے کے بعد سمجھتے ہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کی بنیادی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو چکے ہیں اور یوں مستقل ڈانٹ ڈپٹ ہی کو بچوں کی تمام ضروریات پورا کرنے کی اکسیر اعظم سمجھ کر ہر روز بطور خاص وافر مقدار میں مہیا کرنے کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت اسی طرح کے منفی فقرات نسل نو کا گلا گھونٹنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اور وہ بچہ جس نے ایک کلی سے کونپل اور پھر بڑھ کر شجر سایہ دار درخت بننا ہوتا ہے بے رحم، بے محل اور احمقانہ جملوں کے تھپیڑوں سے مسلسل دبا دیا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں اسی منفی سوچ کے زہر قاتل کو بچوں کی نشوونما کے لیے مہلک ترین ثابت کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ قارئین کو بھرپور انداز میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح والدین اور اساتذہ کے مثبت رویے بچوں کو علمی اور عملی میدان میں عظمت کی بلندیوں تک پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر والدین، اساتذہ اور دوست احباب اپنے مثبت جملوں کی مدد سے کسی بھی بچے میں یہ تاثر پیدا کردیں کہ وہ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے اور اُس کی یہ صلاحیتیں اُسے دنیا میں اعلیٰ مقام دلا سکتی ہیں تو یقین جانیئے وہ بچہ اپنی منزل مراد کی جانب رواں دواں ہو جائے گا اور بہت جلد اپنے علم وعمل اور کردار سے یہ ثابت کردے گا کہ وہ واقعی ایک عظیم ستارہ ہے جو نہ صرف اپنے قرب وجوار کے لیے روشنی کا ذریعہ بنے گا بلکہ پوری دنیا کے لیے اس کا وجود رحمت کا باعث بنے گا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز چوہدری صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ اپنی گوناں گوں مصروفیات میں گھرے ایک ایسے شجر سایہ دار کا کردار ادا کررہے ہیں جسکی شاخیں کئی

جہات میں لوگوں کی رہنمائی کا کام سرانجام دے رہی ہیں۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق استاد، ایک محنتی محقق اور سرٹیفائیڈ لائف کوچ اور ٹرینر ہیں بلکہ عملی طور پر عرصہ دراز سے معاشرے کے پسے ہوئے اور نظر انداز طبقوں کی عملی، سماجی اور معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بطریق احسن کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان کے تربیتی لیکچرز کا یہ وصف بطور خاص قابل ذکر ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ اُن کا لیکچر سن لیتا ہے تو ان کا مستقل طور پر گرویدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر ان کی شخصیت کو ایک جملہ میں سمونے کی کوشش کی جائے تو انہیں ایک درددل رکھنے والا انسان کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے زمانہ حال اور ماضی قریب سے ایسی زندہ اور لافانی مثالیں جمع کر کے پیش کی ہیں کہ جن کو پڑھنے کے بعد انسان اپنے اندر کی سستی اور کاہلی کو تج کر کے میدان عمل میں ازسرنو قدم رکھ کر محنت کی شاہرہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب نہ صرف خصوصی بچوں کے والدین اور اساتذہ کے لیے ایک ایسا انمول تحفہ اور گوہر نایاب ثابت ہوگی جس کی نظیر تا حال ہمارا اردو دان طبقہ پیش کرنے سے قاصر ہے بلکہ یہ کتاب عمومی تعلیم سے وابستہ تمام افراد کے لیے بھی کامیابی کی طرف گراں قدر رہنمائی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ میری دلی دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس صدق دل اور سچی تڑپ کے ساتھ یہ کتاب تحریر کی ہے اللہ رب العزت وہ لگن اور تڑپ قارئین میں بھی پیدا فرمادے اور اس کتاب کو دونوں جہاں میں ان کی بھلائی اور نجات کا ذریعہ بنادے۔ آمین

ڈاکٹر محمد سعید (پی-ایچ-ڈی) سینئر سپیشل ایجوکیشنسٹ لاہور

# عبدالباسط رانا

''ہاں! تم کر سکتے ہو'' میں سمجھتا ہوں یہ وہ جملہ ہے جو اس کتاب کی ترجمانی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی وصف کے کوئی انسان پیدا نہیں کیا اس بات کا یقین آپ کو بھی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ضرور ہوگا۔ ناممکن سے ممکن کا سفر ڈاکٹر صاحب کی عمدہ کوشش ہے جس سے اساتذہ، والدین اور طلبا بھرپور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اپنی اور اپنے بچوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُبھار سکتے ہیں۔ خصوصی تعلیم کے اداروں، تنظیموں اور نوجوانوں کے لیے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ہے۔ میری دعا ہے کہ

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کی اس کوشش کو چار چاند لگائے اور انہیں تعلیم، تحقیق اور ادب کے میدان میں مزید کامرانیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

عبدالباسط رانا (ایگزیکٹو ممبر رائزنگ سن لاہور)

# حرفِ آغاز

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا
اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا
(سورۃ البقرۃ:286)

اللہ عزوجل جو کہ مالک حقیقی، معبود حقیقی اور تمام جہانوں کا خالق ہے۔ اُس کے نام مبارک سے شروع اور اس کے محبوب آقائے دوجہاں، سید الانبیا، تاجدار عرب وعجم، افضل البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بے شمار درود وسلام۔ یہ کتاب اس ناقص العقل کی ایک معمولی سے کاوش ہے۔ میرا شمار ابھی سیکھنے والوں میں ہے لیکن اس کتاب کو لکھنے میں میرے الفاظ سے زیادہ میرا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ میں گذشتہ بارہ سال سے کسی نہ کسی طرح خصوصی افراد سے منسلک ہوں۔ ان کی معذوری، بے بسی اور پریشانیوں کو دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ اللہ رب العزت نے انسان کو احسن تقویم بنایا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے اُس خالق حقیقی نے کچھ انسانوں کو ادھورا چھوڑ دیا ہو؟ کچھ ان کے والدین کی مایوسی، ان کی آنکھوں سے اُمڈتے آنسو اکثر مجھ سے سوال پوچھتے کہ ان کی زندگی کا بھی تو کوئی مقصد ہوگا؟ جب اللہ پاک خود سختی سے مایوسی سے منع فرماتے ہیں تو ان کی مایوسی کا بھی تو کوئی جواب ہو گا؟ اور آج اُس پاک ذات کے فضل سے دو سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ کتاب اُن سب افراد کے لیے پیش خدمت ہے جو مایوسی کا شکار ہیں۔ جو کسی معذوری یا کسی کمی کا شکار ہیں۔ جو زندگی میں اپنی ناکامی کا ذمہ دار لوگوں کو سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں ہر اُس انسان کے لیے

جواب موجود ہے جو اپنی ناکامی کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔ جو زندگی میں کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ جس کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ کھڑی ہے۔ ہر وہ انسان جو کامیابی چاہتا ہے اس کتاب کو پڑھ کر اپنے اندر ایک نیا جذبہ پائے گا۔ اور شکوہ شکایات سے چھٹکارہ پا کر عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لیے خود کو تیار کر پائے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھ کر آپ کی بھی زندگی انشاءاللہ ضرور بدلے گی۔

آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو!

عبدالعزیز چوہدری

# کتاب پڑھنے سے پہلے

وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ (الحجر 56)

''اور اپنے رب کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں ہوتا سوائے گمراہ لوگوں کے''

مایوسی ہمیشہ تکلیف، بربادی اور تباہی کا باعث بنتی ہے، یہ ایک گناہ ہے جس میں کوئی لذت نہیں۔ مگر بعض اوقات ایسے مواقع بھی آ جاتے ہیں جب انسان پر مایوسی غالب آ جاتی ہے۔ معمولی ناکامیاں بھی کامیاب لوگوں کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآن و حدیث میں بارہا مایوسی اور ناامیدی سے منع فرمایا گیا ہے۔ اسی مایوسی اور ناامیدی کے ساتھ سستی اور کاہلی بھی انسان کی کامیابی کی ازل سے دشمن رہی ہیں۔

دنیا کا ہر وہ انسان جو سستی، کاہلی اور آرام پسندی کا شکار ہے، ان کے لیے مشعل راہ یہ کتاب اپنے اندر ہر اس موضوع کو سمیٹے ہوئے ہے، جس پر عمل کر کے ترقی کی راہ میں حائل ان دائمی رکاوٹوں کو باآسانی دور کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والا مجبور ہو جائے گا کہ ایک ہی نشست میں کتاب مکمل کر کے اٹھے۔ ہر وہ انسان جو اپنی کامیابی کو صحت، وسائل، مواقع، حالات کی بہتری سے مشروط کیے بیٹھا ہے، اس کے لئے اس کتاب میں ایسی زندہ اور حقیقی مثالیں موجود ہیں جو اس کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

آج تک آپ نے ہزاروں ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی، جس میں یتیم، مسکین، غریب اور حالات کے مارے ہوئے کردار ہوتے ہیں۔ جنہوں نے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی دنیا میں کچھ ایسا کر کے دکھایا کہ کامیابی ان کا مقدر بنی۔ مگر اس کتاب میں ایسا کچھ نہیں۔ یہ کتاب اس لیے منفرد ہے کہ اس کے تمام کرداروں کی تکلیفیں، مشکلات اور پریشانیاں اُن یتیموں، مسکینوں اور غربت کے مارے لوگوں سے لاکھ گنا زیادہ ہیں۔ یہ کتاب آپ کو ایسے

افراد سے ملوائے گی جو دیکھنے، سننے، بولنے، چلنے پھرنے یا بھاگنے دوڑنے سے قاصر ہیں۔ جن میں بعض تو ناکارہ جسم کے ساتھ صرف زندہ دماغ لیے ہوئے ہیں۔ جن کی ٹانگیں اُن کا بوجھ اُٹھانے کی بجائے اُلٹا اُن کے لیے بوجھ ہیں۔ جو اپنے جسم کو ہلانے سے معذور ہیں۔ وہ عظیم لوگ جو ایک نہیں کئی کئی معذوریوں کا شکار ہونے کے باوجود دنیا کو ایسا سبق سکھا گئے کہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ آج لاکھ مشکلوں سے نکل کر کامیاب ہونے پر، ہر ناممکن کو ممکن کر دکھانے پر وہ دنیا بھر کے لیے زندہ مثال بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف خود جی کے دکھایا بلکہ پوری دنیا کو جینے کا ہنر سکھا گئے۔

آپ کو زندگی کا مطلب سمجھانے کے لیئے، کچھ کر دکھانے کے لیے، آگے بڑھنے اور منزلوں تک جانے کے لیے اور اپنے اُن تمام بہانوں کو رفع کرنے کے لیے یہ کتاب بہت سی زندہ مثالیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کہانیوں کی طرح آپ بھی دنیا کو ایک مثالی کہانی دے سکتے ہیں۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ نے زندگی بھیڑ بکریوں کی طرح ہی گزارنی ہے یا پھر ایک بھرپور زندگی جینا ہے اور دنیا کو بھی جینے کا فن سکھانا ہے۔

قابل سوچ بات ہے کہ اگر دیکھنے، بولنے اور سننے سے محروم ہیلن کیلر بارہ کتابوں کی مصنفہ بن سکتی ہے۔ صرف اپنی آنکھیں جھپک سکنے والا سٹیفن ہاکنگ 54 سال ویل چیئر پر بیٹھ کر دنیا کا سب سے بڑا سائنس دان بن سکتا ہے۔ کسی حادثے میں ٹانگوں سے معذور ہونے والی لڑکی اروما سہنا دنیا کی بلند ترین چوٹی سر کرنے کا اعزاز اپنے نام کر سکتی ہے تو ہم اور آپ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

آج دنیا کے نابینا افراد اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، نامور عہدوں کی زینت بن رہے ہیں تو صرف ایک اپنے ہی جیسے نابینا ''لوئس بریل'' کے مرہون منت۔ اس ایک نابینا لڑکے نے ''بریل'' ایجاد کر کے نابینا افراد کی تعلیمی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ آج ''بریل ڈاٹ'' جیسی عظیم ایجاد کے باعث ہی ہیلن کیلر جیسی عظیم مصنفہ اپنے فنِ تحریر کا لوہا منوانے کے قابل ہو سکیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نہ صرف پانچ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریوں کا اعزاز حاصل کر پائے بلکہ نابینا ہونے کے باوجود وزیرِ تعلیم بنے۔ اس ایک نابینا لڑکے نے دنیا میں ڈاکٹر امیر علی امجد، صائمہ سلیم، صائمہ عمار، ڈاکٹر فرزانہ سلمان، ڈاکٹر عزیزہ سعید، ڈاکٹر شاہدہ

رسول، ڈاکٹر صابر مائکل، ڈاکٹر سلمہ مقبول، سلیمان ارشد، محسن نواز، رانا تاب عرفانی، صابر یا
نبر کن جیسے کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں چہرے اس دنیا کو دیئے۔ جنہوں نے آنکھوں کے بغیر
اپنی انگلیوں کو روشن کر کے ایسی ایسی کامیابیاں سمیٹیں، کہ قوت بصارت والے آج بھی شاید
انہیں خواب ہی سمجھتے ہیں۔ آپ تصور کریں کیسے ایک نابینا فرد کی محنت لاکھوں نابینا افراد کی
کامیابی کا سبب بن گئی۔

اولاد کی خوشی کس ماں کو نہیں ہوتی لیکن یہ ایسے افراد تھے جن کی پیدائش اور زندگی
والدین کے لیے خوشی سے زیادہ پریشانی کا باعث تھی۔ وہ ان کے مستقبل کے بارے میں فکر
مند ہمہ وقت اپنے آنسو چھپاتے پھرتے تھے۔ اپنے بچے کو پہلی دفعہ دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر
رونے والی

''نک وجو کک Nick Vujicic'' کی والدہ جس کے الفاظ تھے کاش یہ ہاتھوں
اور ٹانگوں کے بغیر پیدا ہونے والا بچہ اُس کا نہ ہوتا۔ اُسی نک کے بارے میں کون تصور کر سکتا
تھا کہ وہ بڑا ہو کر ساری دنیا کے جوانوں کے لیے امید بن جائے گا۔ نک نے نہ صرف خود جینا
سیکھا بلکہ وہ آج پوری دنیا میں گھوم کر اپنے ایک ایک اجتماع کے ذریعے ہزاروں لوگوں کو جینے
کے فن سے آشنا کر رہا ہے۔ ایسی ہی نہ جانے کتنی مثالیں آج آپ کے سامنے آنے والی ہیں
جنہیں دیکھ کر آپ کو اپنی اہمیت کا احساس ہو گا اور بے اختیار اللہ کا شکر ادا کرنے کو دل کرے
گا۔ آپ کو اپنی منزل کی طرف بڑھنے کے لیے مزید کون سا معجزہ درکار ہے۔ خود سے سوال
کریں کہ آخر آپ کس وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنے علاوہ ذرا اپنے اردگرد دیکھیں آپ کو
کروڑوں لوگ کتنے چھوٹے چھوٹے بہانے لیے اپنی منزل کو چھوڑ کر بیٹھے ملیں گے۔ انہیں جگانا
آپ ہی کا فرض ہے۔

اس کتاب کو ختم کرنے کے بعد آپ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ زندگی میں
کامیابی کے لیے کوئی بھی رکاوٹ حقیقی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ آپ اگر مثبت سوچ کے مالک ہیں
اور عملی قدم اُٹھانے کے لیے تیار ہیں تو کامیابی یقیناً آپ کی منتظر ہے۔

یاد رکھیں! بلند خواب، واضح مقاصد، مضبوط حوصلہ اور مسلسل جدوجہد اگر آپ کے
اندر موجود ہیں تو آپ عظیم انسان بننے سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ جہاں عام لوگوں کی زندگیاں

ختم ہو جاتی ہیں۔ وہاں سے عظیم لوگوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

دراصل ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہمیں کوئی آ کر حوصلہ دے۔ ہم خود کو آگے بڑھنے کے لیے تھپکی کا محتاج بنا لیتے ہیں۔ اور اسی محتاجی کے باعث ہم انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی آئے اور ہمیں آ کر بتائے کہ ہم کس قابل ہیں۔ اگر لوگوں کی یہ تھپکیاں ہمیں آگے بڑھاتی ہیں تو لوگوں ہی کی تنقید ہمیں پست ہمت بھی بنا دیتی ہے۔ ہم کتنے عجیب لوگ ہیں کہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اپنی ''لگامیں'' اپنے ہی جیسے لوگوں کے حوالے کر رکھی ہیں۔

اگر حقیقی کامیابی درکار ہے تو اس غلامانہ ذہنیت سے خود کو باہر نکالیں۔ اپنا حوصلہ خود بڑھانا سیکھیں۔ آپ کی صلاحیتیں آپ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔ آپ میں اور کامیابی میں صرف ایک چیز کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے ''مستقل عمل''۔ جب آپ محض سوچ کے بھنور سے نکل کر عمل کی دنیا میں قدم رکھ دیں گے پھر آپ کی اپنی کہانی ہو گی۔ پھر آپ کا ہر قدم کامیاب قدم ہو گا۔ پھر آپ کا حوصلہ بے مثال حوصلہ ہو گا۔ پھر آپ کی مثال بھی بے مثال ہو گی۔ اور آپ اوروں کے لیے مشعلِ راہ ہوں گے۔ بے شک اللہ عزوجل نے واضح فرما دیا ہے کہ:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (سورۃ النجم۔ آیت 39)

''اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اُس نے کوشش کی ہو گی''

یاد رکھیں! جب تک آپ زندہ ہیں کوئی بھی ناکامی مستقل ناکامی نہیں ہے بلکہ وہ تجربہ کی ایک سیڑھی ہے جس کے ذریعے آپ نے کچھ نیا سیکھا ہے۔ اس سفر میں مزہ تب ہے کہ کوئی ناکامی آپ کا حوصلہ پست نہ کر سکے۔ طنز و تنقید کے نشتر آپ کی ہمت کو پسپا کرنے کی بجائے یہ سبق دیں کہ تندیٔ بادِ مخالف تو ہمیشہ سے ہی اونچا اڑانے کے لیے ہوتی ہے۔ اور جب کوئی رکاوٹ آپ کو منزل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو، آپ اچھی طرح اس بات پہ یقین رکھتے ہوں کہ بڑی منزلوں کی رکاوٹیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ اور ہر رکاوٹ، ہر ناکامی آپ کو اپنی منزل سے نزدیک تر کر رہی ہوتی ہے۔ اور جب منزل کی اس قربت کو آپ محسوس کرنے لگیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کا حوصلہ پست نہیں کر سکتی۔ پھر منزلیں خود آپ کی منتظر ہوں گی۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔ جی کے دکھانا ہے یا فقط گزارہ کرنا ہے۔

آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ بھی '' کامیابی '' چاہتے ہیں، دنیا میں کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں، آپ شاید کسی رہنمائی کے متلاشی ہیں۔ آپ کو اپنے جیسی مشکلات سے نمٹنے والوں کی مثال درکار ہے۔ مثال کے انتظار کی بجائے خود مثال کیوں نہیں بن جاتے؟ اٹھیں اور خود جگانے والے بن جائیں۔ وقتی لذت اور آرام پسندی سے کنارہ کشی کر کے مستقل سکون کی راہ پکڑ لیں۔ مستقبل کی پشیمانیوں سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اپنی زندہ دلی پر بھروسہ کیجئے۔ یہ کتاب آپ کا ہاتھ تھام کر آپ کی ہر ممکن رہنمائی کرے گی ضرورت صرف اس احساس کی ہے کہ آپ ایک دفعہ یقین کر لیں کہ پوری کائنات میں آپ جیسا دوسرا کوئی نہیں ہے۔

آگے بڑھیے اور دیکھیے وہ کون لوگ تھے جو ناممکن کو ممکن کر گئے۔ جن کی کامیابیوں پر دنیا آج بھی حیران ہے اور اُن کی عظمت کو سلام پیش کرتی ہے۔ پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ اب آپ نے کیسے جینا ہے۔ آپ نے کیسے ایک کامیاب کہانی بننا ہے۔ یہ کتاب آپ کو سب سے بڑا سبق یہی دے گی کہ اگر آپ میں حوصلہ ہے تو پھر کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بے شک ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝

بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہے

(سورۃ التین، آیت 4)

# ہیلن کیلر

## Helen Keller

**دنیا کی پہلی نابینا، گونگی اور بہری گریجویٹ لڑکی کس طرح 12 کتابوں کی مصنفہ اور دنیا کی مشہور ترین شخصیت بنی؟**

ہیلن کیلر کی کہانی قوت سماعت و گویائی اور دیکھنے سے محروم ایک بچی کی کہانی ہے جس نے اپنی معذوری کے باوجود نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ اپنی ہمت اور ولولہ سے دنیا کے ہر اس انسان کے لیے ''مثال'' قائم کی، جو کسی بھی چیز کو اپنی زندگی کی رکاوٹ سمجھتا ہے۔

یہ اس عظیم مصنفہ کی کہانی ہے جس نے نابینا ہونے کے باوجود اس دنیا کو دیکھا، بغیر سماعت کے سنا اور قوت گویائی کے بغیر پوری دنیا میں اپنا پیغام پہنچایا۔ یہ وہ حیرت کدہ ہے جسے انسان جتنا جانتا جاتا ہے اس کی بے یقینی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لڑکی کی ہر کامیابی بلاشبہ ایک عظیم کامیابی ہے۔ جس کے پردے میں جانے کتنی بے بسیاں، بے چینیاں چھپی ہوئی ہیں۔ بلند حوصلوں کی مالک اس بے مثال لڑکی نے ہر اندھیرے اور بے بسی کا ڈٹ

کر مقابلہ کیا اور اس کا روشن چہرہ دنیا کو فقط خوشی کے آنسو ہی دکھاتا رہا۔

اس کہانی کو پڑھنے کا مزہ تب آئے گا جب آپ چند منٹ کے لیے خود کو ''ہیلن'' کی جگہ رکھ کر زندگی کا تصور کریں۔ دو سال کی ننھی سی عمر ہے ابھی الفاظ تک ٹھیک سے بولنا نہیں سیکھے تھے کہ آواز سلب کر لی گئی۔ جب دنیا کو دیکھنا شروع بھی نہیں کیا تھا تو آنکھوں کی روشنی چھن گئی۔ اب نہ وہ سن کے اور نہ ہی دیکھ کر کچھ سیکھ سکتی تھی۔ تصور کریں اسے کیسے کوئی لفظ سکھایا جائے؟ کیسے کوئی بات بتائی جائے؟ اور کس طرح سے کچھ بھی دکھائے بغیر سمجھایا جائے؟

ہیلن کی زندگی کے آغاز ہی میں ہر طرف اندھیرا ہے کوئی آواز نہیں۔ ایک نہ ختم ہونے والی خاموشی۔ کوئی حوصلہ افزا الفاظ نہیں، کوئی زندگی کی مثال نہیں۔ بس گہری خاموشی اور لامحدود اندھیرے۔ ہم زندگی بھر لامحدود چیزیں دیکھ کر اور سن کر سیکھتے ہیں۔ ان گنت باتیں سوال کر کے سمجھتے ہیں۔ ہمارے سیکھنے کے سب سے بڑے ذرائع یہی تین ہیں۔ اور جسکے پاس یہ ذرائع ہوں ہی نا، اس کی زندگی کیسی زندگی ہے۔ اور اگر اس سب کے باوجود وہ کامیاب زندگی ہے تو پھر کیسی بے مثال زندگی ہے۔

27 جون 1880 کو امریکی ریاست الباما کے ایک قصبے میں پیدا ہونے والی ''ہیلن کیلر'' بھی عام بچوں کی طرح نارمل تھی، لیکن 19 ماہ کی عمر میں ایک خوفناک بیماری کے باعث نا صرف نابینا بلکہ قوت سماعت اور قوت گویائی سے بھی محروم ہو گئی۔ جب ''ہیلن'' تعلیم حاصل کرنے کی عمر کو پہنچی تو والدین اپنی بچی کے مستقبل کے لیے سخت پریشان تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور اُن کی بچی کی تعلیم کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اسی خواہش میں اُنہیں ایک ایسا مسیحا ''گراہم بیل'' (ٹیلی فون کے موجد) کی شکل میں ملتا ہے جو انہیں ایک خصوصی سکول کا پتہ دیتا ہے۔ والدہ بچی کو لے کر پرکنس سکول (Perkins School) پہنچتی ہیں جو نابینا افراد کے لیے مخصوص ہے۔ جہاں سکول کے ڈائریکٹر ان کی ملاقات ایک بلند حوصلہ تیس سالہ استانی عینی سیلوان سے کراتے ہیں۔ جو اس کی استاد مقرر ہوتی ہے۔ یہ استانی ہیلن کی زندگی میں انقلاب کی طرح داخل ہوتی ہے اور اس کے گھر میں رہ کر اپنے منفرد انداز سے اُس کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کرتی ہے۔ یوں ''ہیلن کیلر'' اور اسکی استانی کے درمیان 49 سالہ رفاقت کا آغاز ہوتا ہے۔

''عینی'' گھر میں رہ کر ''ہیلن'' کی تعلیم کا حروف تہجی سکھانے سے آغاز کرتی ہے۔ ''عینی'' ابتداً ''ہیلن'' کے ایک ہاتھ میں گڑیا پکڑاتی ہے اور دوسرے ہاتھ پہ اُس کے حروف لکھ کر اُسے نام سکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر اسی طرح ایک ہاتھ پہ پانی گراتی ہے اور دوسرے ہاتھ پہ نام لکھتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ عظیم استانی انڈے سے چوزہ نکلنے تک کا عمل اُسے ہاتھ پر محسوس کراتی رہتی ہے۔ اس طرح سے مشکل ترین تعلیم کا باقاعدہ آغاز گھر میں رہ کے شروع کیا جاتا ہے۔ ایک سال کی انتھک محنت کے بعد وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ باقاعدہ سکول جا کر عام نابینا افراد کے ساتھ سیکھ سکے لہٰذا 1888 میں وہ باقاعدہ سکول جانے لگتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات بہت سے نابینا بچوں سے ہوتی ہے۔ اس سکول کے ماحول نے اس کے حوصلوں کو مزید بلند کر دیا۔ وہ ہاتھوں کے لمس کے ذریعے باقی نابینا بچوں سے گہرے رشتے بناتی چلی جاتی ہے۔

''ہیلن'' کی تعلیم کا دوسرا دور ''بریل'' کی تعلیم سے شروع ہوتا ہے۔ ''بریل'' ایک ایسی ایجاد ہے جس میں اُبھری ہوئی تحریروں کو انگلیوں کے لمس سے محسوس کر کے پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح بریل پر پن سے نقاط بنا کر نابینا افراد لکھتے بھی ہیں۔ ''ہیلن'' کے لیے ''بریل'' بہت مددگار ثابت ہوئی، اسی کی مدد سے ''ہیلن'' نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور باقاعدہ خطوط لکھنے شروع کیے۔ ''ہیلن'' کے خطوط ہی سے سب کو اُس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ ہونے لگا۔

1890 میں اُس کی عظیم ٹیچر عینی نے ''ہیلن'' کو کچھ مخصوص مشقیں کروانی شروع کر دیں، جن کی وجہ سے ''ہیلن'' انگریزی کے حروف تہجی کے مختلف الفاظ کی آوازیں نکالنے لگی۔ لیکن یہ اتنی دھیمی ہوتی تھیں کہ صرف ''عینی'' ہی سمجھ پاتی تھی۔ ''ہیلن'' دوسروں سے بات چیت کے لیے لوگوں کے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ کر بولنا سیکھی۔ اُس کے چھونے کی حس اس میں مددگار ثابت ہوئی۔ اس نے بریل کے بعد رفتہ رفتہ اشاروں کی زبان بھی سیکھ لی۔

پرکنس سکول (Perkins School) میں چھ سال تعلیم کے بعد 1894 میں وہ اپنی ٹیچر کے ساتھ نیویارک چلی جاتی ہے اور دو سال ''راہیٹ ہماسین ڈیف سکول'' سے تعلیم حاصل کرتی ہے۔ 1900 میں ہیلن نے یونانی، لاطینی اور جرمن زبانوں کے ساتھ ساتھ.

الجبرا اور جیومیٹری کے امتحان پاس کیے اور" ریڈ کلف کالج" میں داخل ہوگئی۔ کالج کی مصروف ترین زندگی میں اس نے اپنی زندگی پر کتاب (The Story of my Life) لکھی۔ 1904 میں 24 سال کی عمر میں وہ ریڈ کلف یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل کرتی ہے۔ "ہیلن" اپنی انتھک محنت اور اپنی ٹیچر کی لازوال محبت کے بل بوتے پر بالآخر پوری دنیا میں اچھی سپیکر اور لکھاری کی حیثیت سے اپنی پہچان بنالیتی ہیں۔

کالج کی رسمی تعلیم کے بعد بھی وہ بریل کی مدد سے مختلف زبانوں میں کتابیں شوق سے پڑھتی اور ساتھ ساتھ لکھنے کا کام جاری رکھتی ہے۔ "ہیلن" کو دوسروں کی مدد کر کے سب سے زیادہ خوشی محسوس ہوتی، اسطرح "ہیلن" نے خود کو رفاہ عامہ کے کاموں میں مشغول کرلیا۔

اپنی کتاب (The Story of My Life) میں وہ لکھتی ہیں کہ "میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن وہ تھا جس روز مجھے میری ٹیچر ملی"۔ وہ کہتی ہیں کہ اپنی اس ٹیچر سے میں نے سیکھا ہے کہ پرندے، پھول اور میں خوشی کے ساتھی ہیں۔ یہ میری ٹیچر کی ذہانت، ہمدردی اور پیار کا انداز تھا کہ تمام مشکلات کے باوجود تعلیم کا پہلا سال ہی بہت خوبصورت بن گیا۔

"ہیلن" نے اپنی ساری کوششیں اپنے ہی جیسے دوسرے افراد کے لیے وقف کر دیں۔ وہ ذاتی طور پر لوگوں کی رہنمائی کرتیں اور انہیں زندگی کا مقصد سمجھاتیں۔ وہ نابینا افراد کی بے شمار تنظیموں کی باقاعدہ رکن تھیں۔ دنیا بھر سے انہیں خط موصول ہوتے تھے جن کے وہ باقاعدگی سے جواب دیتیں۔ ان کے خلوص اور محبت کی وجہ سے اُن کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ وہ فطرت کو قریب سے دیکھنا پسند کرتی تھیں۔ اس لیے شہر سے زیادہ دیہات کو ترجیح دیتیں۔ وہ ایک باہمت اور دلیر خاتون تھیں جنھوں نے تمام عمر مایوسی کو قریب نہیں آنے دیا۔ "ہیلن" نے اپنے عزم اور ہمت سے پوری دنیا کے لیے مثال قائم کی۔ آج بھی وہ دنیا بھر کے خصوصی افراد کے لیے "رول ماڈل" کی حیثیت رکھتی ہیں۔

"ہیلن" نے اپنی کامیابی کو خود تک محدود نہیں رکھا انہوں نے 1924 میں امریکن فاونڈیشن فار دی بلائنڈ (American Foundation for the Blind) میں شمولیت اختیار کی اور چالیس سال تک اس تنظیم کے لیے چندہ بھی اکٹھا کرتی رہیں۔ وہ اس کے

علاوہ دنیا بھر میں موجود بے شمار تنظیموں کی اعزازی ممبر تھیں۔ انہوں نے اپنی ٹیچر کے ساتھ چالیس ممالک کا سفر کیا۔ اور اپنی زندگی میں 12 مشہور کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے۔ انہوں نے محض گیارہ سال کی عمر میں "دی فورسٹ کنگ" شارٹ سٹوری لکھی اور بائیس سال کی عمر میں اپنی خود نوشت سوانح حیات "دی سٹوری آف مائی لائف" نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔ 14 ستمبر 1964 کو امریکن صدر نے انہیں "صدارتی ایوارڈ فار فریڈم" سے نوازا جو کہ امریکہ کے دو اعلیٰ ترین اعزازت میں سے ایک ہے۔

قارئین کے لیے یہاں "ہیلن" کے ایک انٹرویو سے اقتباس کا ترجمہ پیش خدمت ہے، جس میں سیکھنے والے ہر انسان کو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ ہیلن کے جذبات اور خواہشات جو صرف تین دن کے لیے قوت بصارت کے طلب گار ہیں، پڑھ کر ہی دل پسیج جائے گا۔ اس مختصر انٹرویو کو پڑھ کر دل خود بخود اللہ کا شکر بجا لائے گا، اور اُس ذات کی عظیم نعمتوں کا آپ کو صیح معنوں میں احساس ہوگا۔

"میں نے اکثر سوچا کہ اگر انسان سے کچھ دنوں کچھ لمحوں کے لیے ساعت اور بصارت لے لی جائے تو یہ اس کے لیے رحمت کا باعث بنے گی۔ اندھیرا اسے بصارت کی قدر کرنا سکھائے گا اور خاموشی آواز کی خوشیوں کا درس دے گی۔ اکثر میں نے اپنے بصارت والے دوستوں کو آزمایا کہ وہ کیا دیکھتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے سیر کر کے واپس آنے والے ایک دوست سے پوچھا آپ نے وہاں کیا دیکھا؟ تو اُس نے جواب دیا" کچھ خاص نہیں"۔

میں نے خود سے پوچھا ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک گھنٹہ سیر کے باوجود بھی نوٹ کرنے کے قابل جنگل میں کچھ نہیں تھا۔ میں جو دیکھنے سے قاصر ہوں سینکڑوں چیزیں صرف چھو کر ہی محسوس کر لیتی ہوں۔ میں ننھی کونپلوں کی تلاش میں شاخوں کو ڈھوتی ہوں جو گہری سردیوں کے بعد بہار کی آمد کا پہلا اشارہ ہیں۔ عام طور پر جب بہت خوش ہوں تو میں آہستگی سے کسی چھوٹے درخت پر ہاتھ رکھ کر پرندے کے گانے کی تھرتھراہٹ محسوس کرتی ہوں۔

اس وقت میرا دل رو پڑتا ہے ان سب چیزوں کو دیکھ سکنے کی خواہش کی وجہ سے۔ اگر میں صرف چھونے سے اتنا لطف اندوز ہو سکتی ہوں تو ان سب کو دیکھنا کتنا پُر کیف ہوگا۔ تو میں نے تصور کیا کہ میں کیا دیکھنا چاہوں گی اگر مجھے تین دن کے لیے ہی آنکھیں عطا کر دی

جائیں تو۔

پہلے دن میں ان لوگوں کو دیکھنا چاہوں گی جن کی رحمدلی اور ساتھ کی وجہ سے میری زندگی اتنی خوبصورت ہوئی۔ میں نہیں جانتی روح کی کھڑکی جسے آنکھ کہتے ہیں اسکے ذریعے ایک دوست کے دل میں کیسے جھانکا جاتا ہے میں ہاتھوں کے ذریعے صرف چہرے کو ہی چھو سکتی ہوں۔ میں قہقہ، اداسی، اور بہت سے دوسرے جذبات کا پتہ چلا سکتی ہوں۔ میں نے ایک دفعہ شوہروں سے اُن کی بیویوں کی آنکھوں کی رنگت دریافت کی تو وہ بس شرمندہ اور پشیمان ہوئے اور تسلیم کیا کہ وہ نہیں جانتے۔ میں وہ کتاب پڑھنا چاہوں گی جو میرے لیے پڑھی گئی ہو اور جو مجھے انسانی زندگی کے گہرے راستوں کا پتہ بتائے۔ دوپہر کے بعد میں جنگل کی سیر کرنا چاہوں گی اور اپنی آنکھوں کو کائنات کی خوبصورتی سے مسحور کرنا چاہوں گی۔ میں رنگدار غروب ہوتے سورج کی عظمت کو سلام کرنا چاہوں گی۔ اس رات میں سو نہ سکوں گی۔

اپنے دوسرے دن میں انسانی ترقی کا مقابلہ دیکھنا چاہوں گی اور میوزیم جانا چاہوں گی۔ میں انسانی روح کی کھوج اسکے فن سے لگانا چاہوں گی۔ وہ چیزیں جنہیں میں چھو کر جانتی تھی اب میں دیکھ سکوں گی۔ دوسرے دن کی شام میں کسی تھیٹر یا سینما میں گزارنا پسند کروں گی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں اگر آپ بینائی کے بغیر چند دن بھی گزار چکے ہوں تو آپ اپنی آنکھوں کو ایسے استعمال کریں گے کہ جیسے کبھی نہیں کیا ہوگا۔ آپ جو کچھ دیکھیں گے آپ اُس سے محبت محسوس کریں گے۔ آپ کی آنکھیں ہر اُس چیز کو دیکھنا چاہیں گی جو اُن کی دسترس میں آنا ممکن ہوگی۔ تب ہی آپ کو صحیح معنوں میں آنکھوں کی قدر ہوگی۔ تب ہی آپ صحیح معنوں میں اس عظیم نعمت کو شناخت کر سکیں گے۔

اگلی صبح میں طلوعِ آفتاب سے دوبارہ ملنا چاہوں گی اور فطرت کی نئی رنگینیاں دریافت کرنے اور نئی خوبصورتیاں آشکار کرنے کو بے چین ہوں گی۔ آج اس تیسرے دن میں روزانہ کی دنیا جیسا دن گزاروں گی اور پھر آدھی رات کے بعد ایک مستقل اندھیرا پھر سے چھا جائے گا اور پھر یہی تاریکی مجھے احساس دلائے گی کہ میں نے کتنی ان گنت چیزیں چھوڑی ہیں۔

میں جو کہ نابینا ہوں بصارت والوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں۔ اپنی آنکھوں کو ایسے

استعمال کریں جیسے کل کو اس نعمت سے محروم ہونے والے ہیں۔ اور یہی اصول باقی تمام نعمتوں کے لیے بھی استعمال کریں۔ آوازوں کو سنیں، پرندوں کے گیت، کسی پیانو کی آواز اور وہ بھی اتنی توجہ سے جیسے آپ کل بہرے ہونے والے ہیں۔ ہر چیز کو چھو کر محسوس کریں کہ اس سے آج ہی کے لیے آپ کو نوازا گیا ہے۔ پھولوں کی خوشبو کو الگ الگ محسوس کریں کہ آج کے بعد آپ محسوس کرنے اور چکھنے سے محروم ہونے والے ہیں۔ ہر حس کو بھرپور استعمال کریں ان کی خوبصورتی اور عظمت کے لیے شکرگزار بن جائیں۔ انہی کی مدد سے آپ اس وسیع تر کائنات کو دیکھ پا رہے ہیں۔ انہی کی مدد سے آپ سیکھ رہے ہیں لیکن میرے نزدیک ان سب میں سب سے خوبصورت احساس دیکھنے کا احساس ہے"۔

ہیلن کے الفاظ آپ جتنی دفعہ پڑھیں گے آپ کی شکرگزاری بڑھتی جائے گی۔ آپ کو احساس ہونے لگے گا کہ آپ کیا کچھ ہونے کے باوجود خود کو "محروم" سمجھ کر ناشکری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ کچھ دیر کے لیے آنکھوں کو بند کر کے ذرا تصور کیجیے بغیر آنکھوں کے آپ کی زندگی کیسی ہوتی؟ آپ کے دن رات کیسے ہوتے؟ آپ خود کو کتنا حوصلہ مند پاتے؟ بہت کچھ محسوس کر کے بھی دیکھ نہ پانا آپ کو کیسا لگتا؟ اس اندھیروں سے بھرپور زندگی میں آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی؟ ذرا تصور کیجیے اگر آپ بولنے سے قاصر ہوتے تو کیسا محسوس کرتے؟ اپنی بات نہ سمجھا پانے پر کیسی بے بسی ہوتی؟ ذرا تصور کیجیے اگر آپ سننے سے معذور ہوتے تو کیسے لوگوں کے ہلتے ہونٹ آپ کو بے چین کرتے۔ آپ کی کتنی بڑی خواہش ہوتی آواز کو سن سکنے کی۔ آپ تصور کر کے کانپ جائیں گے کہ آپ فقط ان تین نعمتوں کے بغیر کیسی زندگی گزار رہے ہوتے۔ آپ جن نعمتوں کے نہ ہونے کا تصور نہیں کر پا رہے ہیں ہیلن نے ان تین نعمتوں کے بغیر بھی ایک بے مثال زندگی گزاری۔ آپ سے ہیلن کی کہانی شکرگزاری کا تقاضہ کرتی ہے۔

ہم روز سنتے اور دیکھتے ہیں کہ ذرا سی حوصلہ افزائی انسان کی زندگی بدل کر رکھ دیتی ہے انسان کے لیے کامیابیوں کے دروازے کھول دیتی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم نارمل لوگوں کو آگے بڑھنے کے لیے بھی اگر قدم قدم پر حوصلہ افزائی درکار ہے تو خصوصی افراد جن کی زندگی میں نارمل افراد کی نسبت رکاوٹیں، پریشانیاں، مشکلیں کئی لاکھ گنا زیادہ ہیں انہیں

کس لیول کی حوصلہ افزائی درکار ہوگی؟

آپ تصور کریں ہیلن کیلر کی زندگی کا جو سننے، بولنے، دیکھنے سے معذور تھیں، جو صرف چھو کر، سونگھ کر سیکھ سکتی تھیں۔ انہیں کس نے حوصلہ دیا زندگی میں کچھ کر گزرنے کا؟ کون سی باتوں نے کون سی تقاریر نے ان کی زندگی بدل دی؟ کس نے اس کو جوش دلایا کہ وہ عالمی معیار کی کتابیں لکھ جائیں؟ اور دنیا بھر میں نہ صرف مشہور ہو جائیں بلکہ کروڑوں افراد کے لیے مشعل راہ بن جائیں۔ آج ان کی کتابیں نصاب کا حصہ ہیں۔ آج اس کی باتیں مایوس لوگوں کے لیے روشنی ہیں۔ اور ناشکروں کو شکر گزاری کا درس دیتی ہیں۔ یہ عظیم تر کامیابیاں بغیر کوئی "موٹیویشن" کی کتاب پڑھے، بغیر کسی لائف کوچ کا سبق لیے کس طرح ممکن ہوئیں؟ تو بڑا واضح جواب سامنے آتا ہے۔

## اندر کی آواز اور خود پر یقین کامل

یہ ہیلن کا اپنے اوپر یقین تھا یہ اس کے اپنے اندر کی آواز تھی کہ اگر مجھے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تو وہ بے مقصد کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جب آپ خود کچھ کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو حالات خود بخود آپ کے لیے سازگار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر قدرت آپ کو عظیم استاد، بہترین دوست، مثالی ماحول خود ہی مہیا کر دیتی ہے۔ بس ضرورت ہے تو اس بات کی کہ اپنے اندر کی آواز سن کر قدم بڑھانا اور مستقل مزاجی قائم رکھنا۔

"ہیلن کیلر" نے اپنی زندگی کے آخری سال بھی نابینا افراد کی تنظیم (Amercan Foundation for the blind) کے لیے عطیات جمع کرنے میں گزارے۔ انہوں نے 88 سال کی طویل عمر پائی اور 1968 میں اپنے گھر میں سوتے ہوئے وفات پائی۔

ہیلن کیلر کی کہانی ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ زندگی میں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ کیسی بھی مشکل کیوں نہ آ جائے اگر آپ بلند ہمت اور مستقل مزاج ہیں تو چاہے آپ میں لاکھ کمی ہو زندگی میں آگے بڑھنے سے، کامیاب ہونے سے آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ انہوں نے اپنی زندگی پر تفصیلاً کتاب (دی سٹوری آف مائی لائف) اسی لیے لکھی کہ لوگ جان سکیں کہ وہ

معذوریوں کی وجہ سے کن کن مشکلات سے دوچار ہوئی اور کس طرح ہر میدان میں سرخرو ہوتی چلی گئی۔ وہ نابینا، بہرے، گونگے افراد کے لیے ایک عظیم مثال بنیں اور انہوں نے ثابت کر کے دکھایا کہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح زندگی کے ہر میدان میں کامیاب ہو سکتیں ہیں۔

آیئے عہد کریں اپنی میسر نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا اور انہیں بھرپور استعمال کر کے زندگی میں کچھ کر گزرنے کا نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے۔ آیئے آج ہی سے کچھ ایسے کاموں کا آغاز کریں جو دوسروں کی کامیابی کے لیے ہوں دوسروں کی فلاح کے لیے ہوں۔ آگے بڑھیے اس وطن کی مٹی کے ابھی بہت قرض باقی ہیں۔

**"دنیا میں روشنیاں پھیلانے کے لیے آنکھوں سے زیادہ دماغ کی روشنی ضروری ہے"۔**

❁❁❁

# سٹیفن ہاکنگ

## Stephen Hawking

ایک معذور ترین شخص کس طرح پچاس سال سے ویل چیئر پر بیٹھ کر فقط آنکھیں جھپک کر دنیا کا عظیم ترین سائنس دان بنا؟

''سٹیفن'' کی کہانی اگر آپ پوری توجہ سے پڑھیں گے تو آپ کے زندگی سے سارے گلے شکوے ختم ہو جائیں گے۔ آپ ہر مشکل ہر پریشانی کے باوجود، زندگی میں کسی بھی طرح کے بدترین حالات آ جانے کے باوجود نہ صرف خود جینا سیکھ لیں گے بلکہ آپ کو دوسروں کے لیے جینا بھی آ جائے گا۔ آیئے دیکھتے ہیں کیسے جب آپ ہار ماننے سے انکار کر دیں تو کامیابیاں آپ کے قدم چومتی ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کیسے جب کوئی کچھ کرنے کی ٹھان لے تو موت بھی منہ موڑ لیتی ہے۔

8 جنوری 1942 کو برطانیہ میں پیدا ہونے والے سٹیفن ہاکنگ نے اپنی زندگی

کا آغاز نارمل بچوں کی طرح کیا۔ جسے نہیں معلوم تھا کچھ عرصہ بعد لاعلاج مرض میں مبتلا ہونے والا ہے۔ وہ پڑھائی میں ایک نارمل طالب علم تھا۔ لیکن کھیلوں میں دلچسپی کی وجہ سے اس کی سکول لائف بہت اچھی گزری۔ وہ ''سائیکلنگ'' کرتا، فٹبال کھیلتا اور روزانہ پانچ کلومیٹر تک دوڑتا۔ زندگی اسی تیز رفتاری سے اُسے یونیورسٹی تک لے آئی۔ وہ اکیس سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کا طالب علم تھا۔ اپنی آنکھوں میں ہزاروں خواب لیے۔ وہ بہت کچھ کر گزرنے کے عزم کے ساتھ ہر صبح بیدار ہوتا اور ایک بھرپور دن گزارتا۔ لیکن پھر اچانک قدرت نے اس کے خوابوں کے درمیان امتحانات کا فیصلہ کیا۔

اس دن بھی وہ نارمل انداز میں یونیورسٹی پہنچا، جب اسے اچانک خود کو بے بس محسوس کیا اور سیڑھیوں سے پھسل کر نیچے گر گیا۔ جب ہوش آیا تو اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ یہ خبر بجلی کی طرح بن کر گری کہ سٹیفن ہاکنگ دنیا کی پیچیدہ ترین بیماری ''موٹر نیوران ڈزیز'' میں مبتلا ہو گیا ہے، جس میں عضلات مرنا اور جسم کے سارے عضلات بیکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے انسان خود کو مرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ایسے مریض کی زندگی عموماً دو یا تین سال میں ختم ہو جاتی ہے اور اب تک یہ مرض لاعلاج ہے۔

سب سے پہلے سٹیفن ہاکنگ کے ہاتھوں نے کام کرنا چھوڑا پھر یہ بیماری اس کے بازوؤں، بالائی دھڑ اور ٹانگوں کو بھی ناکارہ کرتی چلی گئی۔ بالآخر اُس کی زبان بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ 1965 تک وہ ہمیشہ کے لیے وہیل چیئر تک محدود ہو کر رہ گیا۔ سٹیفن ہاکنگ کی یہ حالت ہو گئی کہ دنیا کو پیغام پہنچانے، سمجھانے کے لیے صرف اس کی پلکیں جھپکانے کی صلاحیت باقی رہ گئی۔ 1974 میں ڈاکٹروں نے اُس کی زندگی سے مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔ یہ بھیانک سچ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق اب وہ کچھ عرصے کا مہمان تھا۔

سٹیفن کے اندر اب ایک جنگ شروع ہو چکی تھی۔ سٹیفن کے سامنے دو راستے تھے، یا تو وہ اپنے سرہانے کھڑی موت کا انتظار کرے یا پھر اپنی آخری سانس تک اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے وقف کر دے۔ سٹیفن نے دوسرا راستہ چنا اور فیصلہ کیا کہ وہ چاہے جتنے دن بھی زندہ رہے، وہ اپنے خواب مرنے نہیں دے گا۔ وہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے گا اور

اپنی آخری سانس تک دنیا کے لیے کچھ نہ کچھ کر کے جائے گا۔ تا کہ دنیا جان سکے کہ سٹیفن صرف مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے آنے اور جانے سے دنیا کو فرق پڑنا چاہیے۔ وہ بہت کچھ دنیا کو دے کر جانا چاہتا تھا۔ اُس نے ایسی بے بسی کی حالت میں بھی شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور تادم آخر دنیا کو کچھ کر دکھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن تقریباً 62 سال سے وہ اس معذوری کی حالت میں بھی مسلسل محنت، لگن کو اپنی زندگی کا شعار بنائے ہوئے ہے۔ بے شک افراد اور اقوام کی زندگیوں میں فرق اسی سطح کے بلند فیصلے ہی لے کر آتے ہیں۔

کیا آپ اپنے اندر ایسی حالت میں ایسا حوصلہ مند فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

اگر جذبہ مضبوط ہو تو ماحول خود بخود سازگار بنتا چلا جاتا ہے۔ ایسا ہی اسٹیفن کے ساتھ ہوا، جس حالت میں لوگ موت کی بھیک مانگتے ہیں، اس وقت اسٹیفن نے معذوری کو شکست دے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ کیا، جب بڑے بڑے دماغ کند ہو جاتے ہیں، تب اس نے اپنی سوچ کو مثبت رکھا، اسٹیفن کے اس حوصلہ کو دیکھتے ہوئے کیمبرج یونیورسٹی نے بھی ایک مخصوص کمپیوٹر بنا کر اس کی وہیل چیئر پر فکس کر دیا۔ یہ کمپیوٹر اس کی پلکوں کے ذریعے دیئے گئے پیغامات کو سمجھ کر ترجمہ کرتا، وہ الفاظ کمپیوٹر کی سکرین پر آتے اور سپیکر سے دوسروں تک پیغام پہنچ جاتا۔ اسی حالت میں اسٹیفن نے نہ صرف اپنی ڈگری مکمل کی بلکہ کئی کتابیں لکھنے اور ریسرچ کا کام بھی کیا۔ جب اُس نے وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے کائنات کے بارے میں پیشن گوئی اور دریافتوں کا سلسلہ شروع کیا تو دنیا بھر کے سائنسدان حیرت زدہ رہ گئے۔ سٹیفن کی کائنات کے بارے میں تحقیق اور نظریات کی وجہ سے اس کا دنیا کے بہترین سائنسدانوں میں شمار ہونے لگا۔ بالآخر اس بلند حوصلہ نوجوان کو "آئن سٹائن" کے بعد اس صدی کا دوسرا سب سے بڑا سائنسدان تسلیم کیا جانے لگا۔ 12 اگست 2009 کو سٹیفن ہاکنگ کو امریکہ کے سب سے بڑے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ اپنے تاثرات، خیالات اور احساسات کا اظہار اپنے چہرے سے کرنے سے قاصر وہیل چیئر پر بیٹھا ایک ایسا شخص ہے جس کی کامیابی دنیا میں کسی معجزے سے کم نہیں۔ سٹیفن ہاکنگ کو آج کی دنیا کا ذہین ترین انسان ہونے کا اعزاز بھی

حاصل ہے۔ یہ شخص اس شدید معذوری کے باوجود کامیابیوں کا سفر مسلسل اور تیزی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔

اللہ پاک قرآن کریم میں اس بات کی نشاندہی فرماتے ہیں کہ یہ کائنات ابھی نامکمل ہے اور اس میں ہر روز نئے سیارے پیدا ہو رہے ہیں۔ قرآن پاک کی اس پیشن گوئی کو سٹیفن نے اپنی ''بلیک ہولز'' تھیوری کے ذریعے ثابت کر کے دکھایا ہے۔ سٹیفن کی مشکل ترین زندگی دنیا کو یہ سبق دیتی ہے کہ اگر انسان کے حوصلے بلند ہوں، مستقل مزاجی اُس کا خاصہ ہو، تو دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کوئی معذوری، کوئی مشکل، کوئی حادثہ، کوئی سانحہ، کوئی تکلیف آپ کو آپ کی منزل سے دور نہیں رکھ سکتی۔ کوئی چیز آپ کو کامیابی کے جھنڈے گاڑنے سے نہیں روک سکتی۔ بس شرط ہے ہمت کی، حوصلے کی، تحمل کی۔

ہم مانیں یا نہ مانیں، حقیقت ہے کہ ہماری اپنی نالائقی، پست ہمتی، بہانہ سازی اور بے یقینی ہی مشکلات کو ناممکنات کا نام دے دیتی ہے، ہم ہمت ہار کر، اُسے قسمت کا نام دے کر، ساری زندگی اسے تقدیر کا لکھا کہہ کر ناکامی کو گلے لگا کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ تصور کریں ایک ایسی حالت جس میں اسٹیفن جیسا بلند حوصلہ شخص کئی سالوں سے ہلنے جلنے، چلنے پھرنے، بولنے سے قاصر ہے، زندگی ایسے جیسے بوجھ سی بن گئی ہو، شاید انسان اس حالت میں گن گن کر دن گزارنے لگے اور اُسے موت کے انتظار کے علاوہ اور کوئی نہ سوجھے، اُس حالت میں بھی سٹیفن کی ہمت اور حوصلہ اُسے صدی کے عظیم ترین سائنسدانوں کی صف اول میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔

سٹیفن ہاکنگ کو ایسے ہی دنیا کے بہترین سائنس دانوں میں شمار نہیں کیا، اس نے سائنس کی دنیا میں ایسے ایسے انکشافات کیے، جن کی دریافت کئی سائنس دان خوابوں میں ہی کرتے رہے، سٹیفن نے کائنات میں ایسا بلیک ہول دریافت کیا جس میں سے روزانہ نئے سیارے پیدا ہو رہے ہیں، اُس نے ایسی شعاعیں بھی دریافت کیں جو کائنات کے اندر بڑی بڑی تبدیلیوں کا باعث بن رہی ہیں۔ یہ بات شاید قارئین کے لیے ناقابل یقین ہو کہ فزکس اور ریاضی کے شعبہ میں دنیا کے تمام سائنسدان سٹیفن کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ''اے بریف ہسٹری آف دی ٹائم'' A Brief History

of the Time، جس کا شمار دنیا کی تہلکہ مچا دینے والی کتابوں میں ہوتا ہے، جسے اسٹیفن نے پلکوں کے اشاروں کی مدد سے لکھا ہے۔

اسٹیفن مایوس لوگوں کے لیے زندگی کی ایک بھرپور امید ہے، اُسے دیکھنے والے مایوسیوں کے بھنور سے نکل کر پھر سے جینا سیکھ جاتے ہیں، اُس کی بے مثال کامیابیاں اور جینے کا عزم دنیا کے ہر شخص کے لیے حوصلوں کا سمندر ہے۔

ہر وہ بے ہمت شخص، جو دنیا کی ہر نعمت ہونے کے باوجود قسمت کا رونا روتا ہے، اسٹیفن اس سے سوال کرتا ہے کہ اگر وہ اتنی شدید معذوری کے باوجود آج اس مقام تک پہنچ سکتا ہے تو دیگر لوگ کیوں ساکت ہیں؟ کیوں کچھ بڑا کر دکھانے کے جذبے سے محروم ہیں؟ کس رکاوٹ کو اپنی ہار کا نام دے کر بیٹھ گئے ہیں؟

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس عظیم نعمتوں والی زندگی کے باوجود ایسے پتلے بن کر رہ گئے ہیں جن کا مقصد صرف کھانا، پینا، کمانا، وقت گزارنا ہے، اپنی زندگی کی ڈوریں ہم نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو سونپ رکھی ہیں، وہ جیسے چاہیں ہمیں نچائیں۔ ہم ایسے بہرے بن چکے ہیں کہ ہمارے پاس اپنے اندر کی آواز سننے کے لیے وقت ہی نہیں، اس مشینی دور میں ہمارے پاس رک کر سوچنے کے لیے اتنا وقت نہیں کہ ٹھہر کر، رک کر خود سے پوچھیں کہ آخر اس زندگی کا حقیقی مقصد کیا ہے؟

سٹیفن کے بارے میں ہم جتنا پڑھتے جاتے ہیں اور پھر اُس کا موازنہ اس کی روز مرہ مشکلات اور اس کے جسم سے لپٹی معذوریوں سے کرتے جاتے ہیں تو حیرانگی بڑھتی جاتی ہے کہ یہ سب کیسے ممکن ہے۔ کیسے ایک شخص محض اپنی پلکوں کے بل بوتے پر دنیا کو فتح کیے جا رہا ہے؟ کون سا جذبہ اس کے حوصلوں کو اتنا بلند رکھے ہوئے ہے؟ جسمانی طور پر مفلوج ترین شخص کس طرح ذہانت کا اعلیٰ ترین معیار لیے دنیا کا عظیم ترین سائنسدان بن گیا؟ جس شخص کو کئی سال پہلے میڈیکل کی جدید ترین سائنس لاعلاج قرار دے چکی تھی، آج اسی سائنس میں وہ تہلکہ مچا رہا ہے۔ وہ کون سا ایسا جذبہ تھا جو اُسے زندہ رکھے ہوئے ہے، اور وہ جہدِ مسلسل، محنت، انتھک کوششوں سے بلند اور بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ دنیا کے مشکل ترین مضامین کا "ماسٹر برین" بن چکا ہے۔ دنیا کے سارے سائنسدان اُسے مختلف شعبوں کا "گرو" ماننے پر

مجبور ہیں۔ آخر کیسے؟

بلند حوصلوں اور عملی زندگی کی اس سے بہتر مثال اور کیا پیش کی جا سکتی ہے۔ اُن لوگوں کے لیے بار بار سوچنے کا مقام ہے جو اپنی صحت مند زندگی کو بغیر کسی مقصد کے گزار رہے ہیں اور صرف قسمت کا رونا روتے رہتے ہیں، جن کے دنیا میں آنے اور جانے سے کسی کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اسٹیفن ایک ایسی اعلیٰ مثال ہے دنیا بھر کے ایسے تمام خصوصی افراد کے لیے جو اپنی چھوٹی چھوٹی معذوریوں کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھ بیٹھتے ہیں، مایوسی کی یہ انتہا ہوتی ہے کہ دنیا بھر کا بوجھ اٹھانے کی سکت رکھنے والے خود کو ہی زمین پر بوجھ تصور کرتے ہیں اور وہ اسی خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ وہ کسی قابل نہیں ہیں۔ وہ کوئی عظیم کام کیسے کر سکتے ہیں؟ حالانکہ اُن کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ ان کا خالق، اس کائنات کے شاہکار کو پیدا کرنے والا، سب سے بڑا فنکار اور تخلیق کا ماہر ہے، لہٰذا اس کے تخلیق کردہ ہر انسان یا فن پارے میں چند ایسے گُن ضرور موجود ہوتے ہیں جو اسے دیگر افراد سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عظیم کاریگر کی کاریگری کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے اندر مخفی خوبصورتی کو تلاش کرنا ہے اور اسے جلا دینی ہے تا کہ اللہ کی یہ تخلیق اک بے مثال تخلیق بن کر اُبھر سکے۔

لیکن نادان لوگ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ اگر وہ کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھ سکیں تو اُن کے لیے سٹیفن جیسی بہت مثالیں موجود ہیں۔ انہیں یہ سمجھانے کے لیے کہ زندگی بوجھ اور مایوسی کا نام نہیں ہے۔ اگر وہ ان مثالوں کو سمجھ سکیں تو اُن کے حوصلے کبھی پست نہ ہوں۔ اُنہیں اپنی پہچان ہو جائے۔

سٹیفن نے اُس بے جان ویل چیر پر 65 سال بیٹھ کر جو عزت شہرت کمائی وہ اپنی جگہ، مگر اس مشکل ترین زندگی کے باوجود سٹیفن جو اس دنیا کے لیے کر رہا ہے وہ ایک بلاشبہ ایک عظیم ترین کام ہے۔ اُسے دنیا کے ''ذہین ترین شخص'' کے اعزاز کے ساتھ تقریباً دنیا کے بہترین 13 عالمی ایوارڈز سے نوازا گیا۔

سٹیفن کی زندگی آپ سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھتی ہے۔ کیا آپ نارمل انسان ہیں؟ اللہ نے آپ کو صحت دی ہے اس کے باوجود آپ بہانوں کا لبادہ اوڑھ کر اپنی زندگی کے

دن بوجھل گزار رہے ہیں؟ کیوں آپ کے دماغ میں یہ بات سما گئی ہے کہ یہی زندگی آپ کا مقدر ہے؟ کیوں عظیم کامیابیاں آپ کے لیے نہیں ہیں؟ کیوں آپ کو معمولی معمولی سی مشکلات پہاڑ جیسی نظر آتی ہیں؟ کیوں آپ نے خودساختہ بہانوں اور رکاوٹوں کی جیل میں قید کر رکھا ہے؟ کیا آپ اپنی اس زندگی سے مطمئن ہیں؟ اگر نہیں تو انتظار کس بات کا ہے؟ یاد رکھیں! مل والا کل کبھی نہیں آتا۔ کل کی راہ دیکھنے والے ہمیشہ خودساختہ خول میں قید رہ کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ اُن کی کامیابی کا سورج کبھی طلوع نہیں ہوتا۔ خود کو اس خول سے آزاد کیجیے۔ کیا یہ زندہ مثالیں آپ کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی نہیں کہ زندگی صرف وقت پورا کرنے کا نام نہیں؟

اپنے مقصد کی شناخت کیجیے۔ جو دن بغیر مقصد کے گزر گیا، جس میں آپ نے کل سے بہتر کچھ نہیں کیا اس پر اگر آپ کو افسوس نہیں تو پھر یہ جان لیں! آپ فقط دن پورے کر رہے ہیں۔ جینا تو آپ نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ اگر آپ نے کسی معذوری کو بہانہ بنا لیا ہے تو بھی آپ کو احساس دلانے کے لیے یہ مثالیں کم نہیں ہیں کہ زندگی شدید معذوری کے باوجود بھرپور گزاری جا سکتی ہے۔ آپ قسمت کو الزام دے کر اپنی ذمہ داری سے فرار نہیں ہو سکتے۔ دنیا آپ کی مجبوریوں، پریشانیوں اور خراب حالات کو نہیں بلکہ آپ کی کامیابیوں کو سلام کرتی ہے۔ آخر کس بات کا انتظار ہے؟ دنیا کے ہر کامیاب اور ناکام شخص کو روزانہ ایک جتنے سیکنڈ، منٹ اور گھنٹے ملتے ہیں۔ انہی کو استعمال کر کے کوئی سٹیفن ہاکنگ بنتا ہے، کوئی ہیلن کیلر تو کوئی فقط دن پورے کرتا ہے۔

دوستو! منزل جتنی بڑی ہوتی ہے مشکلات اتنی ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے، مسلسل کوشش، محنت، اور کچھ کر دکھانے کا نام زندگی ہے یا فقط بے مقصد اپنا پیٹ بھرنے اور مُردوں کی طرح پڑے رہنے کا نام زندگی ہے۔ اپنی زندگی میں ہر خوف کو نکال کر اپنے خوابوں کے سفر کا آغاز کریں۔ اس سے پہلے کہ آپ کے دماغ سے چمٹے ہوئے ناکامی کے خوف کے سائے آپ کو اپنی لپیٹ میں لیں اور آپ کی تمام صلاحیتوں کو کھا جائیں۔ اس فصل کو آگ لگا دیں۔ آگے بڑھیں بڑی خوبصورت زندگی آپ کی منتظر ہے۔ آپ کے سامنے دو واضح راستے موجود ہیں۔

خود سے سوال کیجیے کہ آپ خود کو کس راستے میں کھڑا دیکھتے ہیں؟

خود کو وقت دینا شروع کریں، اپنے آپ سے اکیلے میں گفتگو کرنا سیکھیے، یاد رکھیں سب سے خوبصورت سوال وہی ہیں جو آپ خود سے کرتے ہیں۔ سب سے ضروری احتساب وہی ہے جو خود کا ہوتا ہے۔ خود سے اپنے وقت کا اپنی سوچ کا احتساب لینا سیکھ لیں زندگی سنور جائے گی۔ بس اپنے آپ سے مخلص ہو جائیں۔ دنیا کی بجائے اپنی کارگزاری پر بھرپور توجہ دینا شروع کر دیں اور اس عظیم نعمت والی زندگی کو ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید بہتر سے بہتر بناتے چلے جائیں۔ آپ کے لیے دنیا کا سب سے بڑا کوچ آپ کی اپنی ذات ہے۔ اپنی سوچ بلند کریں۔ ہر پہلو میں اچھائی تلاش کریں۔

یاد رکھیں فقط یہ ڈگریاں ہی علم نہیں، دنیا کی بہترین کتابوں کا مطالعہ کرنا سیکھیں پھر آپ پر زندگی کے لامحدود راز کھلنے شروع ہو جائیں گے اور آپ کو احساس ہوگا کہ علم کی حقیقی طاقت کیا ہے۔ آپ جینا سیکھ جائیں گے۔

یاد رکھیں آپ کے بولنے، کرنے، سمجھنے سے بھی ایک چیز طاقت ور ہے اور وہ آپ کی "سوچ" ہے۔ آپ کی زندگی میں آنے والے تمام واقعات اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ جتنی اعلیٰ درجے کی زندگی درکار ہے اسی قدر اعلیٰ درجہ کی سوچ بھی ہونی چاہیے۔ اپنی سوچوں کو کبھی نظر انداز مت کریں، بلکہ انہیں سنوارنے، نکھارنے پر توجہ دیں، پھر اندر کی تبدیلی ہی حقیقی تبدیلی ہوگی جو ہر مشکل سے مقابلہ کرنے کی سکت رکھے گی۔ آج سے ہی اپنی سوچ پر کام شروع کریں۔ اس کا کوئی معیار متعین کریں اور اپنے معیاری مطالعہ میں جتنا ممکن ہو، اضافہ کر دیں۔

اگر "سٹیفن" آج سے 65 سال پہلے ڈاکٹروں کے کہنے پر موت کا انتظار شروع کر دیتا تو اُس کی وہ بیکار زندگی بہت بھیانک ہوتی۔ وہ آج کسی کے لیے مثال نہ بن پاتا، کسی کے لیے مشعل راہ نہ ہوتا۔ اُس نے ہر مشکل کے ساتھ جینے کا عزم کر کے نہ صرف اپنی بلکہ کروڑوں لوگوں کی زندگی خوبصورت بنا دی۔

ہماری اس مٹی کو بے شمار بلند حوصلے اور ہمت والے لوگ درکار ہیں۔ آگے بڑھیے اور گمنام سے نامور ہو جائیے۔ ہمیشہ کے لیے جینے کا فیصلہ کیجیے۔ آپ کی کہانی اتنی شاندار ہونی

چاہیے کہ آپ کے چلے جانے کے ہزاروں سال بعد بھی وہ شاندار رہے۔ مجھے یقین ہے آپ کی زندگی میں مشکلات ''سٹیفن'' سے زیادہ ہرگز نہیں ہوں گی۔ اگر آپ آج چل پڑے تو بڑی منزل کے مسافر ضرور کہلائیں گے۔ سوچنے میں وقت ضائع نہ کیجیے کیوں کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کر جائے پر وہ عمل سے قاصر ہے، آپ عمل والے بن جائیں یقین مانیں آپ امر ہو جائیں گے۔

آزما کر دیکھ لیں، اگر آپ اس راہ پر چل پڑے تو کچھ ہی عرصے میں آپ کو یقین آ جائے گا کہ یہ پگڈنڈی ''شاہراہ حیات'' کی طرف رواں دواں ہے جس پر قدم بقدم عظیم منازل ہیں، جن پر پہنچ کر ہمارے ہی جیسے گوشت پوست کے انسان دنیا کے مایہ ناز افراد میں شمار ہوئے، رہتی دنیا تک ان کا نام اور کارہائے نمایاں امر ہوئے۔ ابھی فیصلہ کیجیے اس راہ پر چلنے کا اور کبھی حوصلہ نہ ہارنے کا۔ انشاءاللہ بہت جلد دنیا کے لیے ''رول ماڈل'' بن جائیں گے۔ بس دیر آپ کے پہلے قدم کی ہے کہ کب اٹھے۔ میں آپ کے اس قدم کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔ سٹیفن کی زندگی سے میں نے سیکھا ہے کہ:

**''زندگی کا جب کوئی مقصد ہو اور آپ ہار ماننے سے انکار کر دیں تو زندگی خود آپ کی جیت کا انکار کرتی ہے''۔**

⚬⚬⚬

# لوئس بریل

## Louis Braille

**ایک نابینا لڑکے نے کس طرح اپنی عظیم ایجاد کے ذریعے نابینا افراد کے تعلیمی نظام میں انقلاب برپا کردیا؟**

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دنیا میں نابینا افراد کی عظیم کامیابیوں کا سہرا ''لوئس بریل'' کے سر ہے، جس نے اپنی عظیم ایجاد ''بریل ڈاٹ'' کو نابینا افراد کے لیے مشعل راہ بنا دیا۔ آج جتنے بھی نابینا افراد، جنہوں نے دنیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، نامور عہدوں پر فائز ہوئے، سب اس ایجاد کی مرہون منت ہے۔ میں جب بھی ان نابینا افراد کی عظیم کامیابیاں دیکھتا ہوں تو ''لوئس بریل'' کو بے ساختہ سلام پیش کرنے کو دل کرتا ہے۔ لوئیس کی زندگی ہمیں بے شمار سبق دیتی ہے۔ یہ لوئیس ہی تھا جس کی وجہ سے ''ہیلن کیلر'' جیسی عظیم مصنفہ لکھنے کا قابل ہوئی۔ صائمہ سلیم، عمارہ یاسر، سردار احمد، سلمان ارشد، فرزانہ سلیمان، عزیزہ سعید، شاہدہ رسول، ڈاکٹر صابر اور ایسے ہزاروں نام منظر عام پر آئے اور دنیا کو آنکھوں کے بغیر اپنی انگلیوں سے دیکھنے کا فن

سکھا گئے۔ ایسی ایسی کامیابیاں سمیٹیں کہ آج آنکھوں والے بھی انہیں فقط خواب تصور کرتے ہیں۔

تصور کیجئے، ایک ایسا بچہ جسے پڑھنے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے، اچانک بینائی سے محروم ہو جائے تو کیا قیامت گزرے گی؟ بچپن میں ایک حادثے میں لوئس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، 1809ء میں پیدا ہونے والا لوئس، 1820ء میں بینائی کی نعمت سے محروم ہو گیا۔ اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا، وہ حادثے سے قبل روزانہ کتابیں پڑھتا تھا، لیکن اچانک اُس کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اس دور میں معذور لوگوں کے پاس دوسروں کے سہارے کے سوا کوئی آپشن نہیں تھا۔ لوئس نے بھی چار سال ٹیوٹرز کے سہارے تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مطمئن نہ تھا۔ اُس نے کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنے کا فیصلہ کیا جسکی مدد سے وہ خود کتابیں پڑھنے کے قابل ہو سکے۔

وہ کام جو صدیوں سے جسمانی اور ذہنی طور پر مکمل صحت مند اربوں لوگ نہ کر پائے اس کا آغاز ایک نابینا شخص نے کیا اور ایک ایسا سسٹم بنانا شروع کر دیا جو ابھرے ہوئے الفاظ والی کتابیں لکھ سکے۔ جنہیں ہر نابینا شخص خود بغیر کسی مدد کے پڑھنے کے قابل ہو سکے۔ اُس نے اسی کام کو زندگی کا مقصد سمجھ لیا اور دن رات اس پر کام شروع کر دیا۔ وہ نابینا لڑکا جو کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا، ایک ایسے مشن پر لگ گیا جو اُس وقت کا بظاہر ایک ''ناممکن'' کام تھا۔

یہ حقیقت ہے جب انسان مستقل مزاج ہو اور کچھ کرنے کی ٹھان لے تو پوری کائنات اُس کی مدد میں لگ جاتی ہے۔ خدا کی ذات کبھی بھی کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتی۔ اور اسی محنت، لگن اور مستقل مزاجی کے بل بوتے پر اُس نے 1839ء میں ایک ایسا ''ڈاٹ سسٹم'' بنا لیا جس کی مدد سے دنیا بھر کے نابینا افراد آسانی سے کتابیں پڑھ سکتے تھے۔ لوئیس نے یہ سسٹم ایجاد کرنے کے بعد باقی زندگی اس کی ترویج اور پھیلاؤ میں لگا دی، وہ 1852ء میں اس دنیا سے تو چلا گیا لیکن دنیا بھر کے نابینا افراد کو روشنی دے گیا۔ اس کی محنت کا صلہ خدا کی ذات نے اس طرح سے دیا کہ 1855 تک اُس کا بنایا ہوا ''بریل سسٹم'' پورے یورپ میں رائج ہو گیا۔ اور پھر یورپ کے 14 ملکوں نے تمام بڑی کتابیں لوئیس کے بریل نظام پر منتقل کرنا شروع کر دیں۔ آج اس کے دیے ہوئے بریل سسٹم کی وجہ سے دنیا کے تمام

نابینا افراد اعلیٰ تعلیم حاصل کر پا رہے ہیں اور نہ صرف اپنی زندگیوں میں انقلاب لا چکے ہیں بلکہ اپنے جیسے کئی افراد کی زندگیاں بدل رہے ہیں۔

ایک لمحہ کے لیے رک کر خود سے سوال کیجیے کیا آپ کی زندگی میں موجود مشکلات نابینا "لوئیس بریل" کی زندگی سے بھی زیادہ ہیں؟ کیا آپ اپنی زندگی کے مقصد سے اس لیے منہ موڑ کے بیٹھ گئے ہیں کہ چند مشکلات نے آپ کا راستہ روک رکھا ہے؟ ذرا حقیقت کی آنکھ سے دنیا کو دیکھیں اور بتائیں کیا کسی بھی انسان نے بغیر مشکلات کے کامیابی حاصل کی ہے؟ یہ مشکلات نہیں فقط کاہلی اور سستی ہے جو آپ کو اپنے مقصد کی پہچان سے، اپنی حقیقی شناخت سے اور ایک عظیم کامیابی سے دور رکھے ہوئے ہے۔

آج لوئس بریل کی وہ دن رات کی محنت دنیا کی 20 عظیم ترین ایجادات میں شمار ہوتی ہے۔ یہ وہ ایجاد ہے جس کی وجہ سے تعلیم سے محروم نابینا افراد آج دنیا کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ آپ آج گوگل پر پی-ایچ-ڈی کرنے والے نابینا افراد تلاش کریں یقین مانیں آپ گنتی بھول جائیں گے۔ یہ "لوئس بریل" تھا جس نے دنیا کو یہ احساس دلایا کہ نابینا افراد بھی عام انسانوں کی طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ بریل کی اس ایجاد کے بعد معذور افراد کے لیے ایجادات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے اور یہ سب وہ ایجادات ہیں جن کی وجہ سے تمام معذور افراد اب معذوری کی زندگی سے نکل چکے ہیں وہ نہ صرف اپنا بوجھ اٹھا رہے ہیں بلکہ اپنے جیسے لاکھوں افراد کی مدد کے لیے بھی دن رات کوشاں ہیں۔ آج دنیا بھر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نابینا افراد لوئیس بریل کو دعائیں دیتے ہیں۔

آج جب ہمارا معاشرہ منفی سوچ، آرام پسندی اور الزام تراشیوں سے بھرا پڑا ہے ہمیں حقیقت میں لوئس بریل جیسے جذبہ کے حامل لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ جو حکومتوں کو اپنی ناکامیوں کی وجہ قرار دینے کی بجائے اپنی ذات کو پہچان کر زندگی کے کسی مقصد پر لگ جائیں اور اس دنیا کو کچھ ایسا دے جائیں کہ اُن کے جانے کے سینکڑوں سال بعد بھی دنیا اُن کی احسان مند رہے اور ان کی جلائی ہوئی شمع سے روشنیاں پھیلتی رہے۔

آئیں عہد کریں آرام پسندی کی زندگی سے نکل کر کچھ کر گزرنے کا، ذہنی بیماری اور لاچاری سے جان چھڑانے کا، اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا۔ اور اسی ایک

زندگی میں ہزاروں سالوں والی زندگی جی کر دکھانے کا۔ آج اس ملک کو ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو مشکلات و مصائب کو کامیابی کا زینہ سمجھیں۔ جو اپنے ساتھ دوسروں کے مستقبل بھی روشن کریں۔ جو بڑی سوچ اور بڑے ظرف کے حامل ہوں۔ جو اپنی ناکامیوں کی وجہ کسی اور کو قرار نہ دیتے ہوں۔ جو کسی معجزے کے انتظار میں اپنی زندگی کو رائیگاں نہ کر رہے ہوں۔

میری زندگی کا تجربہ کہتا ہے کہ:

"جب ہم لوگوں کے لیے جینا شروع کر دیتے ہیں تو ہمیشہ کی زندگی ہمارا مقدر بن جاتی ہے"

❁❁❁

# اروما سنہا

## Arunima Sinha

دنیا کی پہلی ٹانگوں سے معذور لڑکی جو ماؤنٹ ایورسٹ سر کر کے پوری دنیا کو حیران کرگئی۔

زندگی بعض اوقات ہمیں ایسے مقام پر لے آتی ہے کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ ناکام ہو جانا۔ کاروبار کا اچانک تباہ ہو جانا، کسی عزیز کا زندگی سے اچانک چلے جانا یا پھر کسی ہنستے کھیلتے انسان کا اچانک معذور ہو جانا بھی ایسے ہی حادثات میں شامل ہیں۔ ایسی حالت میں اکثر لوگ اپنا حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں اور اُنہیں اپنے اردگرد فقط "اندھیرے" ہی نظر آتے ہیں۔ وہ خیال کرنے لگتے ہیں جیسے زندگی اُن کے لیے ختم ہوگئی ہو۔ وہ اس خوبصورت زندگی کو بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اکثر ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اروما سنہا کی زندگی بھی ایک ایسی ہی مثال لیے ہوئے ہیں لیکن اس میں سوچ کا فرق ہے۔ فیصلے کی قوت اور حوصلے کا فرق ہے۔ خوف سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا فرق ہے۔

اروما سنہا مضبوط قوت ارادی کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس کی زندگی ثابت کرتی ہے کہ اگر انسان اندر سے جینے اور کچھ کر کے دکھانے کا فیصلہ کر لے اور اس پہ ڈٹ جائے تو کوئی ناکامی، کوئی حادثہ، کوئی مشکل، کوئی دکھ آپ کو منزل پر پہنچنے سے نہیں روک سکتا۔

اروما سنہا کی آنکھ ایک غریب گھرانے میں کھلتی ہے۔ وہ بچپن ہی سے ہونہار، محنتی اور قابل ہے۔ وہ سکول میں ہر پروگرام میں حصہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ اسکول میں اروما کا دل پڑھائی میں کم اور کھیل کود میں زیادہ لگتا۔ وقت کے ساتھ کھیل کود میں اس کی دلچسپی مزید بڑھتی جاتی ہے۔ وہ چیمپئن بننے کا خواب دیکھنے لگتی ہے۔ جان پہچان کے لوگوں نے اروما کے کھیل کود پر اعتراض کیا، لیکن ماں اور بڑی بہن نے اروما کو اپنی خواہش کے مطابق کام کرنے دیا۔ اروما کو فٹ بال، والی بال اور ہاکی کھیلنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ جب بھی موقع ملتا وہ میدان چلی جاتی اور خوب کھیلتی۔ اس کا اس طرح میدان میں کھیلنا آس پاس کے کچھ لوگوں کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس پر طرح طرح کے طنز کے جاتے فقرے کسے جاتے۔ دن گزرتے گئے۔ اروما نے اس دوران کئی مقابلوں میں حصہ لیا اور اپنی قابلیت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ اس نے خوب والی بال، فٹ بال کھیلا، کئی ایوارڈ بھی جیتے۔ قومی سطح کے مقابلوں میں بھی کھیلنے کا موقع ملا۔ لوگوں کی حوصلہ افزائی رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں میں بے شمار خواب پیدا کرتی چلی گئی۔ زندگی میں کچھ بننے کا خواب، کچھ کر دکھانے کی لگن اور انہی خوابوں کے ساتھ وہ کالج میں پہنچ گئی۔

اپنی قابلیت اور انتھک محنت سے وہ کالج کی والی بال ٹیم سے قومی ٹیم میں منتخب ہو گئی۔ وہ خود کو قومی ٹیم کی بہترین کھلاڑی کے طور پر بھی منواتی ہے۔ اس مقام تک پہنچنے میں انتھک محنت اور بے شمار کوشش شامل ہے۔ یہ لڑکی اپنی محنت کے رنگ لانے پر بے حد خوش ہے اور اُسے اپنی زندگی کا ہر خواب پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ لیکن قسمت نے اُس کے لیے ابھی اور امتحان منتخب کر رکھے ہیں۔ ابھی قومی ٹیم کا حصہ بننے کی خوشی پوری نہیں ہوئی کہ ایک المناک حادثہ ظاہری طور پر ہر خواب ہر خوشی اُس کی آنکھوں سے نوچ لے جاتا ہے۔

باپ کی موت کے بعد گھر چلانے میں ماں کی مدد کرنے کے مقصد سے اروما کو ملازمت کرنے کا خیال آتا ہے وہ کئی جگہ اپلائی کرتی ہے اور ایک دن اسے مرکزی صنعتی سیکورٹی فورس یعنی

سی آئی ایس ایف کے دفتر سے لیٹر آ جاتا ہے وہ انٹرویو کے لیے ٹرین میں روانہ ہوتی ہے۔ کچھ بدمعاش اس کے گلے سے سونے کی چین چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس پر انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور آخرکار وہ اسے ٹرین سے دھکا دے دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسے وقت باہر پھینکی جاتی ہے جب دوسرے ٹریک پر بھی ٹرین جارہی ہوتی ہے۔ وہ اُس سے ٹکراتی ہے اور دونوں پٹڑیوں کے درمیان گر جاتی ہے۔ اور اس حادثے کے باعث اُس کا ایک پاؤں کٹ جاتا ہے اور دوسرا کچلا جاتا ہے۔ اور بے شمار ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

یہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ساری رات ادھر پڑی رہتی ہے۔ رات بھر چوہے اُس کے زخم نوچتے ہیں اور 49 کے قریب ٹرینز اس کے قریب سے گزرتی ہیں۔ صبح گاؤں کے لوگ اسے دیکھتے ہیں تو اسپتال پہنچاتے ہیں۔ جہاں سہولتیں نہ ہونے کے باعث اس بہادر لڑکی کا پاؤں بغیر بے ہوش کیے کاٹا جاتا ہے۔ آپ تکلیف کا تصور کریں لیکن وہ حقیقت جان چکی ہے کہ درد سے لڑنا ہی زندگی ہے۔ نیشنل کھلاڑی ہونے کے باعث آگے چل کر اس کا علاج بہتر پیمانے پر شروع ہوتا ہے اور وہ زندگی کی طرف لوٹنا شروع ہوتی ہے۔

حادثات تو ہر روز لاکھوں کی تعداد میں رونما ہوتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ جو چیز آپ کی زندگی میں اثر انداز ہوتی ہے وہ آپ کے سوچنے کا انداز ہے۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ وہ حادثہ آپ کو مایوسی کی دلدل میں پھینک دیتا ہے یا پھر آپ اپنے حوصلے کے دم پر دوبارہ سے اُٹھ کر جینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور آپ دنیا کو حوصلہ نہ ہارنے والوں کی زندہ مثال پیش کر کے دکھاتے ہیں۔

اور اسی طرح یہ لڑکی مایوسی، ناکامی اور افسوس کی دلدل میں گرنے کے بجائے پھر سے زندگی سے جنگ لڑنے اور دنیا کو اسی حالت میں کچھ کر دکھانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک سوال چپکا ہے کہ اگر وہ اس بدترین حادثے کے باوجود بھی زندہ ہے تو کسی بڑے کام کے لیے زندہ ہے۔ وہ اپنی معذوری کو مجبوری کا نام دینے سے قطعاً انکار کر دیتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے سوچنے کا انداز ہی ہماری باقی زندگی کا فیصلہ کرتا ہے لہٰذا اروما کی مثبت سوچ نے اُس کی ساری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم جتنی مرضی مثبت سوچ رکھتے [illegible] معاشرے کی اکثریت آپ کو مایوسی کی دلدل میں

پھینکنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ آپ کے حوصلے کا امتحان ہوتا ہے۔

اروما کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا اور اسے بہت سارے منفی سوالوں اور رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہسپتال ہی میں میڈیا کے ذریعے اُس تک یہ خبریں آنے لگیں۔ ٹکٹ نہ ہونے کی وجہ سے ٹرین سے چھلانگ لگائی۔ گھر والوں کے رویے اور ڈانٹ کی وجہ سے دلبرداشتہ ہوکر چھلانگ لگائی۔ برے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کی گئی۔ بے شک مایوس لوگ مایوسی ہی تقسیم کرتے ہیں۔

ایسی بے شمار باتیں اُس تک پہنچتی رہی۔ اروما ان باتوں سے بہت حیران اور پریشان ہوئی۔ وہ اپنے انداز میں الزام لگانے والوں کو جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن بے بس تھی۔ ایک پاؤں کاٹ دیا گیا تھا اور جسمانی طور پر کمزور ہوکر وہ ہسپتال میں بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ بہت کچھ چاہ کر بھی کچھ نہ کر پا رہی تھی۔ حادثات اور تکلیفوں میں گھری اس لڑکی پر جانے کیا گزرتی ہوگی۔ ماں، بہن اور بہنوئی نے اروما کی ہمت بڑھائی اور اسے اپنا جذبہ برقرار رکھنے کا مشورہ دیا۔

ہسپتال میں علاج کے دوران وقت کاٹنے کے لئے اروما نے اخبار پڑھنا شروع کیا۔ ایک دن اسنے ایک خبر پڑھی کہ 17 سالہ ارجن واجپئی نے ملک کے سب سے نوجوان کوہ پیما بننے کا ریکارڈ بنایا ہے۔ اس خبر نے اروما کے دل میں ایک نئے خیال کو جنم دیا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جب 17 سال کا نوجوان ماؤنٹ ایورسٹ سر کرسکتا ہے تو وہ کیوں نہیں؟ اس نے ٹھان لیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرکے رہے گی۔ اُس نے کسی بھی تنقید کو اپنی زندگی اور فیصلوں پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اور ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے یہ فیصلہ کیا کہ آج لوگوں کا وقت ہے جو بولنا چاہتے ہیں بولیں۔ آنے والا کل میرا ہے اور میں ثابت کروں گی کہ میں پست ہمت نہیں بلکہ بلند حوصلوں والی لڑکی ہوں۔ اور اسی حالت میں اس نے دنیا کی بلند ترین چوٹی سر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ثابت کیا کہ بلند حوصلہ لوگ ہی اتنے بلند فیصلے کرسکتے ہیں۔

لوگوں نے اس فیصلہ کو بھی پاگل پن کا نام دیا اور شدید تنقید کی۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ تماشائیوں کا کام فقط شور مچانا ہوتا ہے۔ وہ اپنے فیصلے پر پوری طرح ڈٹ چکی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس خواب کو پورا کرنے کے لیے لاکھوں کا خرچہ کہاں سے آئے گا، کون اُس کی مدد

کرے گا۔ لیکن وہ ہر قیمت پر یہ خواب پورا کرنے کی ٹھان چکی تھی۔ اسی دوران اس کو مصنوعی پاؤں بھی مل گیا۔ اور اس پاؤں کو پہن کر اروما پھر سے چلنے لگی۔

آپ ذرا تصور کریں! ریڑھ کی ہڈی میں تین فریکچر ہیں۔ ایک پاؤں مصنوعی اور دوسرا راڈ کے سہارے پر ہے، پورا جسم زخموں سے چور ہے اور اتنا بڑا فیصلہ! 1924 سے اب تک سینکڑوں لوگ اس چوٹی کو سر کرنے کی خواہش میں اپنی جان گنوا چکے ہیں جو کہ نا صرف نارمل اور مکمل فٹ تھے بلکہ پروفیشنل بھی تھے۔ لیکن اروما سنہا کے الفاظ تھے:

''لوگوں کو بس میرا نامکمل جسم نظر آرہا ہے اسی لیے وہ مجھے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر وہ یہ دیکھ لیں کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے تو انہیں بھی یقین آجائے کہ میرے لیے اب یہ ناممکن نہیں ہے''۔

لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ سب سے بڑا موٹیویٹر آپ کے اندر موجود ہوتا ہے آپ اندر سے بلند حوصلہ ہیں تو ساری دنیا مل کر بھی آپ کو مایوس نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر آپ اندر سے ہی مایوس اور پست ہمت ہیں تو آپ کو اپنے اندر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ آپ کو خود پر کام کرنا ہے۔ آپ کی ہر ناکامی آپ کو سکھانے کے لیے ہے نہ کہ آپ کے حوصلے پست کرنے کے لئے۔

ہسپتال سے وہ یہ سوچتے نکلتی ہے کہ دنیا کو جواب کیسے دینا ہے۔ اور ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیسے کرنا ہے۔ اور سیدھی جا کر بچھی درپال سے جا کر ملتی ہے جو ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والی پہلی ہندوستانی خاتون ہیں۔ بچھی درپال جب اروما کو دیکھتی ہے اور اُس کا مقصد جانتی ہے تو اُس کی آنکھیں حیرت کے آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور وہ کہتی ہے۔

''اروما تم نے اس حالت میں ایورسٹ جیسا خواب چن لیا تم نے اپنے اندر تو ایورسٹ سر کر لیا اب تو بس لوگوں کو تاریخ بتانا باقی ہے''۔

جس طرح مایوس لوگ مایوسی بانٹتے ہیں اسی طرح بلند حوصلہ ہمیشہ حوصلہ ہی تقسیم کرتے ہیں۔ اس طرح اس کٹھن اور مشکل ترین خواب کی تکمیل کا سفر شروع ہوتا ہے۔ حقیقی مشکلات کا اندازہ اُسے ٹریننگ کیمپ میں پہنچ کر ہوتا ہے۔ جب روڈ ہیڈ سے بیس کیمپ تک باقی ساتھی 2 منٹ میں اور اروما تین گھنٹوں میں پہنچتی ہے۔ ہڈیاں ابھی بھی نامکمل جڑی تھی زخم

تازہ تھے اس وجہ سے اس کے جوتے اکثر خون سے بھرے رہتے مگر وہ کسی صورت شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ 2 منٹ کی مسافت کو 3 گھنٹے میں طے کرنا لوگوں کے لیے مایوس کن ہوسکتا تھا لیکن اس حوصلہ مند لڑکی نے اپنے خواب کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ سہنے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ بالآخر مسلسل محنت رنگ لاتی ہے اور 8 ماہ کی تکلیف دہ پریکٹس کے بعد وہ اس قابل ہوجاتی ہے کہ 3 گھنٹے والا سفر دو منٹ سے بھی جلد طے کر کے اپنے پورے گروپ میں سے سب سے پہلے ٹاپ پر پہنچتی ہے۔

اب ماونٹ ایورسٹ کا باقاعدہ سفر شروع ہوتا ہے۔ اور وہ چھ لوگ گروپ میں اپنی منزل کی جانب رواں ہوتے ہیں۔ شدید مشکلات، مصنوعی پاوں کا بار بار مڑ جانا اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ برف میں پڑی ناکام کوہ پیماوں کی لاشیں بڑے بڑے لوگوں کے حوصلے پست کر رہی تھی لیکن اس لڑکی نے ہر موڑ پر ثابت کیا کہ وہ واقعی بلند حوصلے کے ساتھ ساری کشتیاں جلا کے یہاں آئی ہے۔ خراب موسم کے باعث ہر کسی نے اُسے واپس جانے، پھر کبھی دوبارہ کوشش کرنے کی تلقین کی لیکن وہ مر جانے کو تیار تھی لیکن ناکام واپس جانے کو نہیں۔ اُس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور مسلسل آگے بڑھتی چلی گئی۔

ماونٹ ایورسٹ کے بالکل قریب پہنچ کر اُس کے سلنڈر سے آکسیجن ختم ہوگئی۔ اس کے گائیڈ نے چیخ چیخ کر واپس جانے کو کہا لیکن اُس نے اتنی قریب پہنچ کر واپس جانے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ واضح موت کو دیکھ سکتی تھی لیکن وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اور پھر خدا نے اُس پر کرم کیا اور اُسی وقت انہیں ایک کوہ پیما کا اضافی آکسیجن سلنڈر اس برف میں مل گیا۔ اور آخر کار یہ بلند ہمت ماونٹ ایورسٹ سر کرنے والی دنیا کی پہلی معذور لڑکی کا اعزاز اپنے نام کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

ارونما اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہے۔ "لوگ آج بھی اس فیصلہ کو پاگل پن سمجھتے ہیں لیکن میرا فیصلہ لوگوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے دل و دماغ کا فیصلہ تھا اور میرا یہ مقصد ہی میری زندگی بن چکا تھا"۔ وہ کہتی ہے زندگی میں کسی کو بھی اپنا مقصد حاصل کرنا ہے تو اُسے چاہیے وہ اُسے اپنا جنون بنا لے نہیں تو وہ کامیابی تک نہیں پہنچ پائے گا۔ میرا یقین ہے قسمت بھی اُسی کا ساتھ دیتی ہے، جس کے اندر جیتنے کا جذبہ ہے۔

دنیا کی معذور لڑکی جس کے بارے میں لوگوں کو یقین تھا کہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔اس کے لیے دنیا کی پہلی معذور ماؤنٹ ایورسٹس بننا اور بائیس ہزار بلندی پر کھڑے ہو کر اپنی کامیابی پر مسکرانا کتنا خوبصورت ہوگا۔اتر پردیش کی اروما سنہا کو "پدم شری" کے لئے منتخب کیا گیا۔"پدم شری" حکومت کی طرف سے دیا جانے والا چوتھا سب سے بڑا اعزاز ہے۔اروما کو اُس کی شاندار کامیابی پر "ملکہ لکشمی بہادری" ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

21 مئی، 2013 کی صبح دس بجکر پچپن منٹ پر اروما نے ماؤنٹ ایورسٹ سَر کر کے 26 سال کی عمر میں دنیا کی پہلی معذور کوہ پیما بننے کا اعزاز حاصل کیا۔اروما کے خواب آج بھی بہت بلند ہیں وہ عالمی لیول کا سپورٹس کمپلیکس بنانا چاہتی ہے۔اور دنیا کی ساری بلند تر چوٹیاں سر کرنا چاہتی ہے۔

اروما نے ایورسٹ پر سر کرنے سے پہلے زندگی میں بہت اتار چڑھاو دیکھے۔بہت مشکلات کا سامنا کیا۔کئی بار توہین سہی۔موت سے بھی جدوجہد کی۔مخالف حالات کا سامنا کیا، لیکن کبھی ہار نہیں مانی۔کمزوری کو بھی اپنی طاقت بنایا۔مضبوط ارادے، محنت، جدوجہد اور ہار نہ ماننے والے جذبے سے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔دنیا کے سب سے بلند پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اروما نے ثابت کیا کہ حوصلے بلند ہوں تو اونچائی معنی نہیں رکھتی، انسان اپنے عزم، ہمت اور محنت سے بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔اروما سنہا جدوجہد اور کامیابی کی وجہ سے دنیا بھر میں لوگوں کے لئے مثال بن گئی۔

آپ نے زندگی میں چاہے جیسے بھی حالات دیکھے ہیں۔آپ چاہے کامیابی کے جتنے بھی قریب سے واپس لوٹے ہیں۔ایکدم برے حالات نے آپ کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔آپ کو اپنے خواب پورے ہوتے نظر نہیں آ رہے تو ہرگز مایوس مت ہوں۔اپنا حوصلہ جمع کیجیے۔خود پر یقین کر کے دیکھیں منزلیں آپ کے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے بے تاب ہیں۔بقول سگمنڈ فرائیڈ اگر آپ کو اپنے کام سے محبت ہو جائے تو ایک خوشگوار زندگی آپ کی منتظر ہے۔لہٰذا اپنے اُس کام کو ضرور تلاش کریں جس میں آپ دل سے اپنی محبت کو شامل کر سکیں۔

خود کو ہرگز اُن لوگوں میں شمار نہ کیجیے گا جو اپنے ادھورے خواب لیے قبرستانوں میں

لیتے ہیں۔ انہیں خود پر یقین نہیں تھا لہٰذا اُن کے خواب بھی مر گئے پر آپ ابھی زندہ ہیں آپ کے خواب بھی زندہ ہیں یہ حقیقت ہو سکتے ہیں۔ آپ بھی اگر اروما کی طرح چاہیں تو ہر خواب سچ ہو سکتا ہے چاہے وہ ایورسٹ جتنا بلند ہی کیوں نہ ہو۔ آپ نے صرف میدان عمل میں اترنا ہے۔

اس کہانی کو پڑھ کر اگر آپ زندگی میں کچھ کر دکھانے کا حوصلہ محسوس کر پا رہے ہیں۔ آپ نے اپنے خوابوں کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو آپ نے اس کہانی کو دیئے گئے وقت کی قیمت حقیقت میں ادا کر دی ہے۔ اروما کی کہانی سے میں نے سیکھا ہے کہ:

"احساس جاگ جائے تو زندگی جاگ جایا کرتی ہے"

❁❁❁

# ایرک ویہین مایر

## Erik Weihenmayer

ایک ایسا نابینا مصنف جس نے دنیا کا حیران کن اعزاز اپنے نام کرلیا۔

زندگی میں انسان نے کچھ کر کے دکھانا ہو تو اُس کے حوصلے کے لیے اُسے اپنے جیسے انسانوں کی اتنی مثالیں ملیں گی کہ وہ گن نہیں سکے گا۔ لیکن انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اپنی آرام پسندی سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ وہ اپنی گزر بسر کے لیے آسان اور آرام پسند طریقے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے سب بیٹھے بٹھائے ہوتا چلا جائے۔ اسی وجہ سے دن بدن وہ عمل سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے رسک لینے سے ڈرنے لگا ہے۔ وہ چاہتا ہے بس کسی نہ کسی طرح وقت گزرتا چلا جائے۔ وہ خود سے یہ تک نہیں پوچھ پاتا کہ کیا واقعی وہ وقت پورا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی نہ تو اپنی زندگی متاثر کن ہوتی ہے اور نہ وہ کسی کی زندگی سے متاثر ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں وقت پر چارہ ملتا رہے تو وہ گائے بھینس

کی طرح ایک ہی جگہ بیٹھ کر ساری زندگی گزار دیں۔

جو لوگ جانتے ہیں کہ وہ اشرف المخلوقات ہیں۔ ان کے لیے اس کائنات کو تسخیر کر دیا گیا ہے۔ ان کے لیے یہ زندگی بہت چھوٹی ہے۔ وہ ہر لمحہ کو عمل میں لا کر کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے علاوہ پوری دنیا کے لیے جینا چاہتے ہیں۔ ناممکن کا لفظ اُن کی کتاب میں ہوتا ہی نہیں۔ وہ نہ صرف خود جی کر دکھاتے ہیں بلکہ اپنے جیسے لاکھوں لوگوں کا حوصلہ بنتے ہیں۔ ایسے ہی حوصلہ پیدا کرنے والی ایک اور عظیم کامیابی کی مثال ایرک کی ہے۔

ایرک کی کہانی ایک عظیم کامیابی کی کہانی ہے۔ وہ 23 ستمبر 1968 کو امریکہ میں پیدا ہوا۔ وہ اس وقت مشہور اتھلیٹ، لکھاری اور موٹی ویشنل سپیکر ہے۔ اُس کی کہانی میں سب سے خاص بات یہ ہے کہ جب میراتھن میں بھاگا تو اپنے ساتھیوں کو دیکھنے سے قاصر تھا۔ جب وہ ریسلنگ رنگ میں اترا تو اپنے مخالف کو دیکھنے سے محروم تھا۔ جس جہاز سے اُس نے جمپ لگایا، جن طلبا کو اُس نے پڑھایا انہیں دیکھ نہیں پایا اور سب سے خاص بات وہ دنیا کا واحد فرد ہے جو دنیا کی بلند ترین پہاڑی پر اترا تو اُس کی بلندی اور اپنے اردگرد موجود پستیوں کا موازنہ کرنے سے قاصر تھا۔ دنیا کی سات بلند ترین چوٹیوں کو سر کرنے والا ایرک دنیا کو محو حیرت چھوڑ کر ریکارڈ پر ریکارڈ بناتا چلا گیا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ سب آخر کیسے ممکن ہوا۔

اُس نے جب ہوش سنبھالا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ نظر کی شدید کمزوری کا شکار ہے۔ چند فٹ سے آگے اُسے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ وہ چند ہی سالوں میں بالکل بینائی سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے باوجود وہ انتہائی متحرک بچہ تھا۔ وہ سکول کے ہر ایونٹ میں بھرپور حصہ لیتا۔ کتاب کو ناک کے قریب لا کر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی نظر ساتھ چھوڑتی گئی۔

والدین نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کو خود پر اعتماد کرنا سکھایا۔ وہ سکول میں فٹ بال، باسکٹ بال کھیلتا، اور اپنے والد کے ساتھ سائیکلنگ کرتا اور پھر تیرا سال کی عمر میں جا کر وہ مکمل طور پر اپنی بینائی سے محروم ہو گیا۔ لیکن اس نے بریل سیکھنے اور سفید چھڑی کا استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا وہ دنیا کو دیکھنا چاہتے تھا اس میں خوب سیر کرنا چاہتے تھا۔

وہ سکول کے زمانے سے ریسلنگ کا شوق رکھتا تھا لہٰذا اُس نے نیشنل ریسلنگ

ٹیم شپ میں باقاعدہ حصہ بھی لیا۔ 16 سال کی عمر میں اس نے اپنے لیے گائیڈ ڈاگ رکھ لیا۔ وہ والد کے ساتھ 16 سال کی عمر سے پہاڑوں پر لے جانے لگا۔ اور ان کے ساتھ مل کر پہاڑوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ کام وہ بہت اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں۔ تب اسے کوہ پیمائی سے محبت ہو گئی۔

انہی دنوں اس کی والدہ کا کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ ایرک کے الفاظ میں یہ صدمہ اس کے لیے نابینا ہونے سے بھی ہزاروں گنا زیادہ تھا۔ یہ وقت اُس کے لیے زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ والدہ اس کا حوصلہ اُس کا اعتماد تھیں۔ اُسے لگنے لگا شاید اس کی دنیا ہی ختم ہو گئی ہے۔ اسے اپنی زندگی میں بہت بڑا خلا محسوس ہونے لگا۔ جب یہ سب والد نے زیادہ محسوس کیا تو وہ اسے اور باقی بھائیوں کو لے کر مختلف ملکوں مثلاً پیرو، سپین، پاکستان، اور پاپوا نیو گنی میں گئے۔ ایرک نے نابینا افراد کے ایک کیمپ میں شامل ہو کر اپنے جیسے نابینا لڑکوں کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ اس نے اپنے انسٹرکٹر سے سیکھا کہ کس طرح اپنے حسیات کو استعمال کرتے ہوئے اور دماغ میں تصویریں بنا کر کیسے آپ پہاڑوں کو سر کر سکتے ہیں۔ 20 سال کی عمر میں وہ کوہ پیمائی کے حوالے سے بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔

اس نے بوسٹن کالج سے انگلش اور کمیونیکیشن کے ساتھ گریجویشن مکمل کی۔ پھر وہ ماسٹر ڈگری کے لیے کیمبرج یونیورسٹی چلا گیا۔ جہاں فیس کے پیسے پورے کرنے کے لیے اس نے بہت جگہ نوکری کی کوشش کی لیکن کسی نے بھی اُسے رکھنے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ نابینا تھا۔ وہ سخت مایوس ہوا۔ بالآخر وہ وہاں سے واپس آ کر ایک مڈل سکول میں ٹیچر لگ گیا۔ اس تجربے نے بھی اُسے زندگی میں آگے چل کر بہت فائدہ دیا۔ اگر وہ آرام پسند ہوتا تو زندگی جہاں رک بھی سکتی تھی لیکن اس صورت میں آج آپ اس کی کہانی نہ پڑھ رہے ہوتے۔

اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر اپنے علاقے ایریزونا میں موجود پہاڑوں کو سر کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ کچھ سال تک اسی کی پریکٹس کرتے رہے۔ پھر انہوں نے 1995ء میں چیریٹی کی غرض سے الاسکا جا کر امریکہ کی سب سے بڑی ماؤنٹین میکنلی سر کرنے کا فیصلہ کیا جس کی بلندی 20000 فٹ ہے۔ جو کہ ایک نابینا فرد کے لیے تو دور کی بات ایک دیکھنے والے کے لیے بھی بہت مشکل ہو سکتا تھا۔ لیکن ایرک نے اپنے چھ عدد پارٹنرز کے ساتھ مل کر

اسے انیس دن میں سر کر لیا۔

2004 میں اس نے صابریا نبرکن کی فاؤنڈیشن سے تبت کے چھ نابینا لوگوں کے ساتھ مل کر شمال کی جانب سے 21500 فٹ ایورسٹ کو سر کیا۔ جو نابینا افراد کے لیے پہلا اتنا بڑا ریکارڈ تھا۔ جس کے اوپر بلائنڈ سائیٹ کے نام سے ایک ڈاکومنٹری بھی بنی۔ اس کے بعد انہوں نے دنیا کی سات بلند ترین چوٹیاں بھی سر کر ڈالیں۔

دنیا کی اربوں آنکھوں کے لیے یہ چوٹیاں آج بھی ایک ناممکن خواب کی طرح ہیں لیکن ایرک نے دنیا کو کر کے دکھایا کہ ناممکن کسی چیز کا نام نہیں ہوتا۔ صدیوں سے نابینا افراد ایسے کام کرتے آ رہے ہیں جو کہ نارمل لوگوں کو بھی ناممکن نظر آتے ہیں۔ لیکن ایرک کی جیت اتنی بڑی اور واضح ہے کہ اس کے حوصلے اور بہادری کو سلام کرنے کو دل کرتا ہے۔

جس نے دنیا کی بلند ترین چوٹی کو سر کیا ہے۔ وہ بھی سوچتا تو ہوگا کہ وہ ہمالیہ جس کو سر کرنے کی چاہت میں سینکڑوں صحت مند مہم جو اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ جن کے جسم آج بھی ہمالیہ کی برف میں دفن ہیں۔ اس ہمالیہ کو سر کرنے کی یہ اندھی کوشش کہیں آخری کوشش ہی ثابت نہ ہو۔

ایرک نے دنیا کو یہ ثابت کر کے دکھایا کہ جو بھی چیز آپ کو دیکھنے میں ناممکن لگتی ہے وہ ہرگز ناممکن نہیں ہے۔ جسے سوچا جا سکتا ہے اُسے کیا بھی جا سکتا ہے بات صرف سوچ کو وسیع اور دل کو بڑا رکھنے کی ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں کے اندھیرے کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی چوٹی کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ بے شک زندہ دل لوگ اپنے مسائل نہیں اپنی کامیابیاں دیکھتے ہیں۔

آپ اگر ایرک کی کامیابی کو سمجھنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں تو ایک دن آنکھیں بند رکھ کر گزار کے دیکھیے۔ اگر یہ نہیں ماونٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا سوچیں۔ دنیا کی اکثریت اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل کو ہمالیہ بنا دیتی ہے۔ وہ خود کو دنیا کا مظلوم ترین انسان سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کبھی مشکلات کو دیکھا ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو فقط اپنے کثرتِ زدن سے نکلنے کو موت سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

ایسے ہی کروڑوں لوگ بجلی نہ ہونے پر، گرمی زیادہ ہو جانے پر، کسی چھوٹے سے

امتحان میں ناکام ہو جانے پر، کاروبار میں ہلکا سا نقصان ہو جانے پر زندگی سے شکوے کر رہے ہوتے ہیں۔ اور دنیا کو بتا رہے ہوتے ہیں کہ انہوں نے بہت مشکلیں دیکھیں ہیں۔ خدارا! آپ اپنا شمار ایسے لوگوں میں نہ کرائیے گا۔ منزلوں کا تعین کرنا سیکھ لیں۔ بلند خواب دیکھیں۔ چھوٹی چھوٹی مشکلات کے رونے رو کر ہر گز اپنے مقام کو پست نہ کریں۔ آگے بڑھیے ابھی بہت سے ناممکنات کو ممکن کرنا باقی ہے۔ دنیا کو اپنے کام سے اپنا نام دے کے جائیں۔ ایرک کی کہانی نے مجھے یہ سبق دیا کہ:

**"کامیابی آپ کی ظاہری حالت کو نہیں بلکہ آپ کے جنون اور جذبے کو دیکھتی ہے"**

# نک وجِک
## Nick Vujicic

بغیر ٹانگوں اور بازوؤں کے پیدا ہونے والے ایسے انسان کی کہانی جو اپنی کامیابیوں کی وجہ سے پوری دنیا کے لیے مثال بنا ہوا ہے۔

یہ کہانی ہے ایک ایسے بچے کی جس کی پیدائش کا سب سے زیادہ دکھ اس کی والدہ کو ہوا۔ وہ ٹانگوں اور بازوؤں کے بغیر پیدا ہونے والے اس بچے کی پیدائش کے مقصد کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ ڈاکٹروں کو سوالیہ نظروں سے دیکھتی اور شدت سے رونا شروع کر دیتی۔ وہ ایک ایسا بچہ تھا جسے دیکھ کر ڈاکٹر بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے، کیونکہ اس کا میڈیکل سائنس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔
اس کی پیدائش آسٹریلیا کے شہر میلبورن میں ہوئی۔ پیدائش کے وقت ہی نہ تو اس کے بازو تھے اور نہ ہی ٹانگیں۔ کسی کو بھی اس کی پیدائش کی خوشی نہیں تھی۔ اس کا نام نک وجِک

رکھا گیا۔ اُس کی ماں کو کسی نے بھی اس بیٹے کی پیدائش پر مبارک باد دینا گوارا نہ کیا۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو اُسے اپنی اذیت بھری زندگی کا احساس ہوا۔ وہ اپنا کوئی بھی کام خود نہیں کر پاتا تھا۔ روزمرہ زندگی میں ہر چیز اس کے لیے مشکل تھی، برش کرنے سے لے کر واش روم جانے تک اپنے کام خود سے نہ کر پانا اُس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

زندگی اُسے بوجھ لگنے لگی۔ وہ مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ میلبورن کے جس اسکول میں وہ زیرِ تعلیم تھا، وہاں اس کے سب ساتھی اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اپنی معذوری کے باعث اتنے طنز اور تکلیفیں دیکھنا اس قدر ناقابل برداشت تھا کہ محض دس سال کی عمر میں اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار بھی ہوا۔ وہ سوچتا تھا اُس سے کوئی محبت نہیں کرے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے اُس کو اُس کی حالت میں قبول کرنا شروع کر دیا اور اُس سے محبت کرنے لگے۔

وہ کہتا ہے ہر شخص کی زندگی میں ایسے مایوس اور بے بسی کے دن آتے ہیں۔ یہ سب فطری ہے۔ لیکن ایسے احساسات اسی وقت نقصان دہ ہوتے ہیں جب آپ اپنے آپ کو ان خیالات کے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں اور ان سے نکلنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا بہتر سے بہتر کر دکھانے کے لیے خود کو ان خیالات سے نکالنا بھی سیکھیں۔

پھر آنے والے سالوں میں دنیا نے دیکھا کہ جس کی پیدائش کا مقصد سمجھنے سے اس کے والدین قاصر تھے۔ اُس نے نہ صرف اپنی دنیا بنائی بلکہ اپنے جیسے کروڑوں مایوس لوگوں کے لیے زندگی کی امید بنا۔ اُس نے نہ صرف خود جینا سیکھا بلکہ دنیا کو جینے کا ہنر سکھا رہا ہے۔ پوری دنیا میں ایک تحریکی مقرر کے طور پر معروف نک کی زندگی ایک مثال بن گئی ہے جو کروڑوں لوگوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دس برس کی عمر میں خودکشی کی کوشش کرنے والے نک نے کامیابی کی کون سی چابی تلاش کر لی، جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ نک نے ایسا کیا کر دکھایا کہ اپنے دونوں بازوں اور مکمل ٹانگوں سے محروم ہونے کے باوجود اس وقت نہ صرف عالمی تنظیم لائف ودآؤٹ لمبس (Life with out Limbs) کے بانی ہیں بلکہ ایک موٹی

ویشنل کمپنی (Attitude is Altitude) کے سربراہ بھی ہیں۔ یہ ادارے دنیا بھر میں
معذور افراد کے درمیان امید اور اعتماد پیدا کرنے کے لیے کام کرتے ہیں انہوں نے اپنے
تجربات پر مشتمل دو کتابیں (Life without limits and Unstopable) بھی
تحریر کیں ہیں. آج نک نے اپنی زندگی کو کامیاب بنا کر لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں
انقلاب برپا کر رکھا ہے۔

اگر آپ بھی خود کو بدلنا چاہیں۔ آگے بڑھنا چاہیں یا کامیاب ہونا چاہیں تو زندگی
کے اندھیروں سے نکلنے کے لیے کسی کا ایک جملہ ہی کافی ہوتا ہے۔ نک کو یہ جملہ 17 سال کی عمر
میں ہائی اسکول میں صفائی اور بحالی کے انچارج سے ملا۔ انہوں نے نک کو عوامی طور پر لیکچر
دینے کا مشورہ دیا۔ اس سوچ نے نک پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے۔ نک اپنے ایک انٹرویو
میں بتاتے ہیں کہ

''میری ان سے دوستی ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے کہا تمہیں مقرر بننا چاہیے، میں
نے کہا کہ میں کیا بولوں گا؟ تو انہوں نے جواب دیا تمہیں اپنی زندگی کی کہانی لوگوں کو
بتانی چاہیے۔''

اس ایک مشورہ نے نک کی قسمت بدل دی۔ انہوں نے مثبت رویے اور طرز فکر کو
اپنانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی ذات پر اتنی محنت کی اور خود کو ایسا مثالی بنایا کہ وہ لوگوں کو
اپنی کامیابی کی کہانی سنا سکیں۔ اب تک نک نے تقریباً پچاس ملکوں میں گزشتہ پندرہ سال میں
ہزاروں لیکچر دیے ہیں۔

آج دنیا بھر کے معذور لوگوں کے لئے نک ایک امید کی کرن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ
معذور لوگوں کو ویل چیئر دینے یا ان کے لیے کوئی عمارت بنانے سے تبدیلی نہیں آئے گی، انہیں
اعتماد دینے کی ضرورت ہے کہ وہ بھی کچھ کر سکتے ہیں۔

نک کہتے ہیں، ''جب دوسرے لوگ اپنے خوابوں کو حاصل کر سکتے ہیں تو ہمیں بھی
کوشش کرنی چاہیے۔ میں اپنی جانب سے پوری کوشش کرتا ہوں۔ ہمیں ضرور کوشش کرنی
چاہیے''۔

وشنل کمپنی (Attitude is Altitude) کے سربراہ بھی ہیں۔ یہ ادارے دنیا بھر میں معذور افراد کے درمیان امید اور اعتماد پیدا کرنے کے لیے کام کرتے ہیں انہوں نے اپنے تجربات پر مشتمل دو کتابیں (Life without limits and Unstopable) بھی تحریر کیں ہیں۔ آج نک نے اپنی زندگی کو کامیاب بنا کر لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر رکھا ہے۔

اگر آپ بھی خود کو بدلنا چاہیں۔ آگے بڑھنا چاہیں یا کامیاب ہونا چاہیں تو زندگی کے اندھیروں سے نکلنے کے لیے کسی کا ایک جملہ ہی کافی ہوتا ہے۔ نک کو یہ جملہ 17 سال کی عمر میں ہائی اسکول میں صفائی اور بحالی کے انچارج سے ملا۔ انہوں نے نک کو عوامی طور پر لیکچر دینے کا مشورہ دیا۔ اس سوچ نے نک پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے۔ نک اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ

''میری ان سے دوستی ہوگئی تھی۔ انہوں نے مجھے کہا تمہیں مقرر بننا چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں کیا بولوں گا؟ تو انہوں نے جواب دیا تمہیں اپنی زندگی کی کہانی لوگوں کو بتانی چاہیے۔''

اس ایک مشورہ نے نک کی قسمت بدل دی۔ انہوں نے مثبت رویے اور طرز فکر کو اپنانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی ذات پر اتنی محنت کی اور خود کو ایسا مثالی بنایا کہ وہ لوگوں کو اپنی کامیابی کی کہانی سنا سکیں۔ اب تک نک نے تقریباً پچاس ملکوں میں گزشتہ پندرہ سال میں ہزاروں لیکچر دیے ہیں۔

آج دنیا بھر کے معذور لوگوں کے لئے نک ایک امید کی کرن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ معذور لوگوں کو ویل چیئر دینے یا ان کے لیے کوئی عمارت بنانے سے تبدیلی نہیں آئے گی، انہیں اعتماد دینے کی ضرورت ہے کہ وہ بھی کچھ کر سکتے ہیں۔

نک کہتے ہیں، ''جب دوسرے لوگ اپنے خوابوں کو حاصل کر سکتے ہیں تو ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے۔ میں اپنی جانب سے پوری کوشش کرتا ہوں۔ ہمیں ضرور کوشش کرنی چاہئے''۔

وہ معذور لوگوں سے اپیل کرتے ہیں" کبھی کوشش کرنے سے ڈرنا نہیں چاہیے، ناکامی سے ڈرنا نہیں چاہیے اور کسی بات سے جھجکنا بھی نہیں چاہیے۔ کسی کام سے شرم نہیں کرنی چاہیے۔"

یہ بات واضح ہے کہ زندگی کے سفر میں تمام تر مشکلات کے باوجود نک نہ توڑ کے اور نہ انہیں کوئی روک پایا۔ نک حوصلے کے ساتھ ان مشکلات سے نبرد آزما ہوتے رہے، ان کی محنت رنگ لائی۔

آج وہ کسی بھی عام انسان کی طرح کام کرتے ہیں۔ وہ روزانہ سوئمنگ کرتے ہیں، پانی کی سطح پر سرفنگ کرتے ہیں اور اسکائی ڈائیونگ کرنے کا سنسنی خیز لطف بھی اٹھاتے ہیں۔ نک آج کل لاس اینجلس میں اپنی بیوی کین اور دو سال کے بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے گزار رہے ہیں۔

نک کی کامیاب زندگی میں ہر انسان کے لیے بے شمار سبق ہیں۔ وہ جو بچپن میں اپنے وجود سے نالاں رہتا تھا۔ جو اس لیے مرنا چاہتا تھا کہ وہ ادھورا ہے۔ کوئی اُس سے محبت نہیں کرے گا۔ وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھنے سے قاصر خود کو دوسروں پر بوجھ خیال کرتا تھا۔ اگر وہ تب مایوس کن خیالات سے خود کو باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو آج کیسے اتنی کامیاب زندگی گزار رہا ہوتا۔ آج کیسے وہ کئی افراد کی کفالت کر رہا ہوتا۔ وہ کیسے ایک اچھا باپ کہلاتا اور کیسے لوگ اُس سے امید کی روشنی پا رہے ہوتے۔

لہٰذا یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ زندگی میں چاہے جیسے بھی حالات ہوں۔ آپ کو اپنے سامنے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ نظر آ رہی ہوں۔ ان مشکل حالات سے نظریں نہ چرائیے۔ اپنی ذات پر بھروسہ کیجیے۔ اپنی صلاحیتوں پر کبھی شک نہ کیجیے۔ یقین کریں آپ جتنی مشکلات سہہ سکتے ہیں اتنی ہی اُس ذات کی طرف سے آپ کو دی جاتی ہیں۔ ہر مشکل میں بہتری کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے مایوسی میں امید کا دامن ہرگز نہ چھوڑیں۔ زندگی میں مواقع کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اپنے ذہن کو کھلا رکھیں گے تو مواقع آپ کو ضرور نظر آتے رہیں گے۔ آگے بڑھتے جائیں اور کامیابیاں سمیٹتے جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ

کے شب و روز نک کی زندگی سے زیادہ مشکل ہرگز نہیں ہوں گے۔ ایرک کی کہانی نے مجھے سبق دیا کہ:

"کامیابی کا راز بھرپور جسم میں نہیں بلکہ بھرپور سوچ اور یقین میں پوشیدہ ہے"

❁❁❁

# صائمہ سلیم

## Saima Saleem

اُس بہادر نابینا لڑکی کے عزم اور حوصلے کی داستان جو پاکستان کی پہلی سی ایس ایس آفیسر بن کر دنیا بھر کے افراد کے لیے رول ماڈل بنی۔

دنیا میں کچھ لوگ ایسا بلند حوصلہ اور مضبوط عزم رکھتے ہیں کہ انہیں ہر ناممکن چیز ممکن نظر آتی ہے۔ اُن کا یقین اتنا بلند اور پختہ ہوتا ہے کہ انکی وجہ سے حکومتوں کو اپنے قانون بدلنے پڑتے ہیں۔ پھر جب وہ ہر ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیتے ہیں تب مایوس کرنے والے لوگ انہیں رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کہانی اس ملک کی بیٹی صائمہ سلیم کی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ دنیا کے رنگ دیکھتی، اس کی خوبصورتی اور روشنیوں میں کھو جاتی اُس کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ ابھی اُس کے قدم زمین پر لگنا بھی شروع نہیں ہوئے تھے کہ

اُس کی زندگی میں اندھیرے چھا گئے۔ والدین پڑھے لکھے سمجھدار تھے بیٹی کی بے بسی اور بے بسی دیکھ کر تڑپ جاتے۔ لیکن انہوں نے اپنے دل میں مایوسی اور بے بسی بسانے کے بجائے یہ عہد کیا کہ وہ اپنی بیٹی کی زندگی میں کوئی کمی نہیں آنے دیں گے اور اس کی زندگی کو کامیاب زندگی بنائیں گے۔

لہٰذا جب اُس کی تعلیم کا دور شروع ہوا تو والدین نے بھرپور وقت دیا۔ والدین ہر سبق کی کیسٹ ریکارڈ کر کے رکھ جاتے جسے وہ سکول سے آ کر سنتیں اور یاد کرتیں۔ اس طرح وہ بچپن ہی سے سکول میں اچھی پوزیشن کی حامل رہیں۔ اور انہوں نے انتھک محنت خود اعتمادی کے باعث نہ صرف گریجویشن بلکہ ماسٹرز میں بھی گولڈ میڈل حاصل کیا۔

اُن کی شروع سے خواہش تھی کہ وہ سی۔ ایس۔ ایس کر کے فارن سروسز میں جائیں اور اپنے ملک کا نام روشن کریں۔ لیکن اُس وقت نابینا افراد سی ایس ایس میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے درخواست کی کہ اُن کا امتحان کمپیوٹر پر لے لیا جائے لیکن انہیں صاف انکار کر دیا گیا۔ لیکن وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور بالآخر صدر پاکستان نے پبلک سروس کمیشن کو ہدایت جاری کیں کہ وہ نابینا افراد کا امتحان کمپیوٹر کے ذریعے لینے کا آغاز کریں۔ یہ اُن کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اُن کی ذہانت اور کوششوں کے پیش نظر پہلی دفعہ پاکستان میں بریل کے ذریعے سی ایس ایس امتحان کا آغاز ہوا۔ ان کا جب رزلٹ آیا تو دیکھنے والے حیران رہ گئے کیونکہ انہوں نے پورے ملک میں خواتین میں پہلی اور مجموعی طور پر چھٹی پوزیشن حاصل کی تھی۔

لیکن مشکلیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے نابینا ہونے کے باعث انہیں فقط چار شعبوں (اکاؤنٹس، کامرس، انفارمیشن، پوسٹل) میں جوائن کرنے کی منظوری دی۔ جبکہ اُن کا خواب وزارت خارجہ کا تھا۔ وہ اپنا خواب ٹوٹتا نہیں دیکھ سکتی تھی لہٰذا دوبارہ ڈٹ گئی۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے انہیں اپنا معاون خصوصی بننے کی پیش کش کی جس کو انہوں نے قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ پھر مسلسل محنت اور کوشش کے بعد بالآخر وزیر اعظم پاکستان نے اپنی خصوصی ہدایات جاری کرتے ہوئے انہیں وزارت خارجہ میں جوائن کرنے کی اجازت دے دی۔ جو کہ بلاشبہ ان کی دن رات کی سخت محنت کا ثمر ثابت ہوئی۔

اپنی قابلیت کا لوہا منواتے ہوئے وہ سی ایس ایس کی تمام فارن ٹریننگ میں بھی وہ ٹاپ کر گئی۔ اور اس کامیابی پر فارن سروسز اکیڈمی کی جانب سے بھی انہیں گولڈ میڈل دیا گیا۔ اپنی قابلیت کی بنا پر انہوں نے امریکن یونیورسٹی کا سکالرشپ حاصل کیا اور ہیومن رائیٹس میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔

صائمہ سلیم 2009 سے جنیوا اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مشن میں کام کر رہی ہیں۔ صائمہ سلیم بچپن سے بالکل نابینا ہے، اور ان کو پاکستان کی ہیلن کیلر کہا جاتا ہے۔ وہ نابینا افراد کے لیے امید کی ایک کرن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ صائمہ اس وقت عالمی انسانی حقوق پر کام کر رہی ہیں۔ وہ ایک ایسی عظیم لڑکی ہیں جو اپنی انتھک محنت اور نمایاں کامیابیوں سے پوری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کر رہی ہیں۔

صائمہ سلیم نہ صرف ہمارے بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال ہیں۔ وہ پاکستان میں موجود لاکھوں خصوصی افراد کے لیے بھی رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''اگر آپ کی لگن سچی ہے تو کوئی بھی مشکل آپ کو منزل سے دور نہیں رکھ سکتی۔''

''جب انسان کو کسی بھی معذوری کا روگ لگ جاتا ہے تو قدرت اس کے اندر مخفی حسیات کو جگا دیتی ہے جو اس کی محرومی کا مداوا بن جاتی ہیں''۔

صائمہ کی کامیابی میں بھی ان کی فیملی نے بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کے والد نے اپنی بیٹی کی تعلیم کے لیے سینکڑوں کیسٹس ریکارڈ کی جنہیں سن سن کر وہ سیکھتی رہیں۔ اور اسی طرح وہ اپنی تعلیم میں نکھار لانے میں کامیاب ہوئیں۔

پاکستان میں صائمہ سلیم کے کامیاب کردار کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری کامیابی کا دارومدار ہمارے اندر موجود سوچ کے معیار پر ہوتا ہے۔ جتنے بلند حوصلے ہمارے اندر ہوتے ہیں اتنی بڑی کامیابی ہماری منتظر ہوتی ہے۔ پاکستان میں جہاں نارمل اور قابل ترین لوگ اکثر سی ایس ایس میں ناکام رہتے ہیں جیسا کہ اس دفعہ 2016 میں تحریری امتحان میں کامیابی کی شرح صرف دو فیصد رہی اور ایسے امتحان میں ایک نابینا لڑکی کا نہ صرف کامیاب ہو جانا بلکہ پوزیشن حاصل کر لینا یقیناً کسی معجزے سے کم نہیں۔

اب بھی میرے وطن میں بے شمار صائمہ جیسی بیٹیاں موجود ہیں۔ جنہیں ذرا سی امید درکار ہے۔ تھوڑی سی توجہ اور رہنمائی ان کی بھی زندگی بدل سکتی ہے۔ وہ بھی اس وطن کا نام روشن کر سکتی ہیں۔ آپ ان بچیوں پر اعتماد کر کے دیکھیں یہ کبھی آپ کو مایوس نہیں کریں گی۔

میرے وطن کے لاکھوں نوجوان سی ایس ایس جیسے امتحان کو پاس کرنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ اُن سب کو یہ کہانی پیغام دیتی ہے کہ ممکن اور ناممکن صرف ہمارے اندر کی باتیں ہیں۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے لیکن یقین نہیں ہے تو آپ ناکام ہو جائیں گے۔ آپ کے پاس آنکھیں تک نہیں ہر طرف اندھیرے ہیں لیکن آپ کے اندر یقین کی روشنی موجود ہے تو پھر سب کچھ ممکن ہے، کامیابی آپ کی ہے۔

لہٰذا کسی بھی امتحان میں کامیابی کے لیے اپنے اندر کے یقین کو مضبوط کیجیے۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کامیابی آپ کے قدموں میں ہوگی۔ لہٰذا اپنے اندر حوصلہ اور یقین بڑھایئے عملی قدم اُٹھایئے آپ کے خواب آپ کی کامیابی آپ کی منتظر ہے۔ صائمہ سلیم کی کہانی نے مجھے یہ سبق دیا کہ

"آپ کے اندر کی روشنی دنیا کی ہر روشنی سے اہم اور خوبصورت ہے"

❁❁❁

## صائمہ عمار

Saima Amar

بچپن میں بینائی سے محروم ہو جانے کے باوجود کیسے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پاکستان کے خصوصی افراد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی

مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب لوگ آنکھوں جیسی عظیم نعمت کے ہوتے ہوئے بھی کسی کام کو ناممکن سمجھ لیتے ہیں۔ ان کو دنیا میں موجود وہ عظیم لوگ بھی نظر نہیں آتے جو نابینا ہوتے ہوئے بھی بینا لوگوں کے لیے مثال ہیں۔ آپ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے ذرا تجزیہ کریں کہ آپ خود کو کہاں دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان میں سب سے بڑی نعمت آنکھیں ہیں جن کی مدد سے ہم اللہ کی بنائی ہوئی کائنات اور اپنی دنیا کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نعمت کتنی عظیم ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

لیکن جب انسان کوشش کرتا ہے تو وہ عظیم ذات انسان کی کسی محرومی کو دیکھ کر نہیں نوازتی۔ وہ تو جذبہ دیکھ کر ہمت دیکھ کر اور عزم اور ارادے کی مضبوطی کو مدنظر رکھ کر نوازتی ہیں۔

صائمہ عمار بھی ان لوگوں میں سے ایک ہیں۔ جنہوں نے محرومیوں کے باوجود ایک کامیاب زندگی گزاری۔ وہ مشہور شاعر انور مسعود کی بہو اور شاعر اور ادیب عمار مسعود کی اہلیہ تھیں۔ وہ آنکھوں سے ضرور معذور تھیں مگر ان کے حوصلے معذور نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی معذوری کو مجبوری نہیں بننے دیا۔ اس عظیم خاتون نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس تعلیم کو صحیح معنوں میں استعمال بھی کیا۔ انہوں نے دوسروں پر بوجھ بننے کے بجائے نہ صرف اپنا بوجھ خود اٹھایا بلکہ اپنے جیسے ہزاروں لوگوں کو مجبوری سے بچانے اور معاشرے کا کارآمد شہری بنانے کا عزم کر لیا اور اس کو عملی شکل دے کر یہ بات ثابت کر دی کہ انسان اگر ہمت کرے تو دنیا کا ہر کام ممکن ہے۔ صائمہ عمار ڈھائی سال کی تھیں جب بخار کے باعث آپٹک نرو متاثر ہونے کی وجہ سے ان کی بینائی چلی گئی۔ بعد ازاں انہوں نے ابتدائی تعلیم لندن سے حاصل کی۔ برطانیہ کے واسیٹر کالج فار بلائنڈ سے اے لیول کرنے کے بعد پاکستان آ گئیں اور قائداعظم یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا۔ اپنی اعلیٰ قابلیت کو ثابت کرتے ہوئے انہوں نے اوپن میرٹ داخلہ ٹیسٹ میں ہزار امیدواروں میں ٹاپ کیا۔

صائمہ عمار ملک کی پہلی نابینا ایم بی اے کرنے والی لڑکی تھیں۔ اور اس عظیم خاتون نے اپنی باقی ساری زندگی کو نابینا افراد کیلئے وقف کر دیا۔ انہوں نے معذور افراد کے مسئلے پر امریکہ سمیت مختلف ممالک میں منعقدہ انٹرنیشنل کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ صائمہ عمار پہلی پاکستانی نابینا لڑکی تھیں جس نے 14-12 مئی 2008ء میں انٹرنیشنل وزٹر پروگرام بیورو آف ایجوکیشن اینڈ کلچرل افیئرز میں شرکت کی۔ صائمہ عمار آڈیو ورلڈ جیسے عظیم پراجیکٹ کی بانی تھیں۔ یہ پروگرام نابینا افراد کو تعلیم اور تفریح کیلئے کیسٹیں فراہم کرتا ہے۔ اس پراجیکٹ کی وجہ سے نابینا افراد کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا۔ اور انہیں اپنی مرضی کا علم گھر کی دہلیز پر ملنے لگا۔ صائمہ نے نابینا افراد کیلئے تربیتی ورکشاپس، سول سوسائٹی اور ٹی وی چینلز پر لیکچرز بھی دیئے۔ فاطمہ جناح جیسی بڑی یونیورسٹی میں آپ ایکسٹرنل ایگزامینر بھی رہیں۔

آپ نے 1988 میں پاکستان فاونڈیشن فائٹنگ بلائنڈنس ( Pakistan

(Foundation for Fighting Blindness) کی بنیاد رکھی۔ اس نان پرافٹ ادارے کا مقصد نابینا افراد کیلئے طبی تحقیق، مفت علاج اور فلاحی خدمات فراہم کرنا ہے۔۔ اس ادارے نے اپنی مدد آپ کے تحت 12 ہزار سے زائد خاندانوں کا ڈیٹا اکٹھا کیا اس فاونڈیشن نے آئرلینڈ، فرانس، امریکہ، سوئٹزرلینڈ، کینیڈا، جاپان، ہالینڈ، اٹلی اور دیگر ممالک میں منعقدہ کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی ہے۔ فاونڈیشن کے پاس چھ سو ایسے خاندان رجسٹرڈ ہیں جن میں ہر خاندان میں تین افراد نابینا ہیں جبکہ ایک سو سے زائد ایسے خاندان ہیں جن میں 5 یا زیادہ افراد نابینا ہیں۔

ان کی بنائی گئی فاونڈیشن نے نابینا افراد کے لیے تعلیمی میدان میں انقلابی کام کیا۔ خصوصی طور پر آڈیو ورلڈ یا بولنے والی کتابوں کی لائبریری تمام نابینا افراد کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اس لائبریری میں نابینا افراد کے لیے کتابوں کی جگہ آڈیو کیسٹیں رکھی گئی ہیں۔

فاونڈیشن کتاب پڑھ کر ریکارڈ کر کے دینے والے کو باقاعدہ معاوضہ ادا کرتی ہے۔ صائمہ عمار جنہوں نے یہ عظیم کارنامہ سرانجام دیا، 22 دسمبر 2011ء کو نروس ڈس آرڈر کے باعث صرف 41 سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔

وہ ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ چاہتی تو سکون سے گھر میں رہ کر اپنی زندگی بسر کرتی۔ وہ چاہتی تو خود کو آرام پسندی کی نظر کر کے پرسکون زندگی گزار سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے مشکلوں کے سفر کا انتخاب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد اس دنیا سے چلے جانے کے باوجود وہ داستان رقم کر گئی۔

صائمہ عمار جیسے عظیم کردار اس دنیا سے چلے بھی جائیں تو ان کا کام ان کی یادیں ہمیشہ کے لیے رہ جاتی ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہوتا ہے کہ ہم چند دن کے لیے جینا چاہتے ہیں یا پھر ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ اُن ہی کی جدوجہد کا کمال ہے کہ نابینا افراد زندگی کے ہر شعبے میں آگے آ رہے ہیں۔ اُن کے انقلابی تعلیمی پروگراموں سے بے شمار لوگ آج بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ وہ اپنے حصے کی شمع روشن کر گئی ہیں۔ اب اس سے ہم نے اپنے اپنے حصہ کے چراغ روشن کرنے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو دنیا میں سب کیلئے روشنی ہو سکتی ہے۔ ان کی

مختص کردہ ترجیحات آج بھی تنظیم کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں جو انہیں آگے بڑھنے کا راستہ دکھاری ہیں۔

آپ کے لیے صائمہ عمار کی زندگی ایک رول ماڈل ہو سکتی ہے۔ آپ بھی اپنی فکر چھوڑ کر دنیا کے غم گسار بن سکتے ہیں۔ آپ بھی اپنی ناک اور اپنے خاندان سے آگے کا سوچ سکتے ہیں۔ آپ بھی ایک عام انسان سے خاص انسان بن سکتے ہیں۔ بابا جی کہا کرتے تھے پیٹ اپنا پیٹ تو جانور بھی بھر ہی لیتے ہیں۔ انسان تو وہ ہے جسے اپنے درد سے زیادہ دوسروں کا درد محسوس ہو۔ لہٰذا اگر آپ خصوصی فرد ہیں تو اپنی محنت لگن اور خود اعتمادی سے آپ بھی اس خوبصورت زندگی کا راز پا سکتے ہیں۔ خدا ہم سب کو اپنے ساتھ دوسروں کے لیے بھی جینے کی توفیق عطا فرمائے۔

"دوسروں کے لیے زندگی وقف کرنے والے ہمیشہ کی زندگی جیتے ہیں"

❁❁❁

# منیبہ مزاری

## Muneeba Mazari

**پاکستان کی اس بہادر بیٹی کی کہانی جسے زندگی کے حادثوں نے جینا سکھا دیا**

منیبہ کو پاکستان کی آئرن خاتون کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بلند حوصلہ، مسکراتا چہرہ اور چمکتی آنکھیں ان کی زندہ دلی کی پہچان ہیں۔ وہ اس وقت پاکستان کے بے شمار لوگوں کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ لوگ جو مشکلات سے گھبرا جاتے ہیں۔ زندگی کے حادثات جن کے حوصلے پست کر دیتے ہیں اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے منیبہ مزاری زندہ مثال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی کامیاب زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ رکاوٹیں، مشکلات، حد بندیاں اور حادثات صرف وقتی چیزیں ہیں۔ اگر ہم انہیں دماغ پر سوار کر کے بیٹھ جائیں تو یہ ہمیں منزل سے دور کر دیتے ہیں۔ اس دنیا میں ہماری دماغی حد بندی کے علاوہ ایسا کچھ نہیں جو ہمیں کامیابی سے روک سکے تو ان چیزوں کو دماغ پر سوار کرنے کی

بجائے اپنے جنون اور اپنے مقصد کو بروئے کار لائیں۔

منیبہ مزاری مارچ 1987 کو ایک بلوچ فیملی کے ہاں پیدا ہوئیں۔ منیبہ نے عام لڑکیوں ہی کی طرح پرورش پائی اور فائن آرٹس میں گریجویشن مکمل کی۔ بیس سال تک ایک عام سی زندگی گزارنے والی یہ لڑکی اچانک حادثہ کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی کا مشکل ترین اور پُر درد دور کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن قدرت اسے تکلیف کے ساتھ بلند تر حوصلہ کی نعمت سے بھی نواز دیتی ہے۔

حادثات ہماری زندگیوں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں منیبہ کی زندگی بھی ایک ایسے ہی حادثے سے بدلی منیبہ رحیم یار خان سے واپسی کے لیے سفر کر رہی تھی۔ وہ بھی عام دنوں جیسا دن تھا۔ 20 سالہ منیبہ اپنی آنکھوں میں خواب سجائے خوشی سے نہال اپنے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ اڑتے پرندے، غروب ہوتا سورج اس کے سفر کو مزید پُر کیف بنا رہے تھے۔ ڈرائیور کی ذرا سی غفلت سے اس کی گاڑی حادثہ کا شکار ہوتی ہے اور کھائی میں جا گرتی ہے۔ اس طرح اچانک ایک خوبصورت زندگی اچانک درد تکلیف اور مسلسل امتحان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بہت سی چوٹیں آئیں مگر انکی زندگی کی سب سے بڑی چوٹ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنا تھا۔ وہ بھی ایک ایسی جگہ جہاں ان کو ایمبولینس کی سہولت بھی میسر نہیں آ سکتی تھی۔ لہذا ٹوٹی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ انہیں جیپ میں ڈال کر لے جایا گیا۔

منیبہ کو جب ہوش آتا ہے تو شدید تکلیف ٹوٹی ہڈیاں اور بے حس ٹانگیں اُسے قیامت کا احساس دلاتی ہیں۔ اسی حالت میں اسے قریبی ہسپتال پہنچایا جاتا ہے۔ اذیت سے بھرپور ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ ذرا تصور کریں آپ کے پاس دنیا بھر کی سہولتیں ہوں۔ آپ کو رہنے کے لیے شاہی کمرہ دے دیا جائے تو آپ کتنے دن اس بیڈ پر گزار سکتے ہیں؟ ایک ہفتہ؟ ایک ماہ؟ دو ماہ؟ منیبہ اس حالت میں سات سو سے زائد دن ہسپتال کے بیڈ پر گزارتی ہے۔ انکے 5 آپریشن ہوئے اور آج انکا آدھا جسم مفلوج ہے۔ اس حادثے کے بعد وہ اپنی دونوں ٹانگوں کے استعمال کی قوت کھو بیٹھی تھیں

ایسے میں انہیں بھی بے شمار خیالات آتے ہیں وہ بھی اپنا ماضی کھنگالتی ہیں۔ ایک چیخ ہر روز ان کے اندر بھی اٹھتی ہے کہ کیوں؟ آخر میرے ساتھ ہی کیوں؟ بڑے بڑے لوگ

ایسے موقعوں پر حوصلہ چھوڑ دیتے ہیں۔ زندگی بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ انسان پاگل ہونے لگتا ہے اور سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔ مایوسی اُس کا اوڑھنا ہوتی ہے اور وہ خود کو دنیا کا مظلوم فرد محسوس کرنے لگتا ہے۔ 20 سال کی عمر میں تو ابھی انسان نے دنیا سے سیکھنا شروع کیا ہوتا ہے ابھی تو اس نے ٹھیک سے تجربات کے سمندر میں قدم بھی نہیں رکھا ہوتا جبکہ بڑے بڑے تجربہ کار ایسے موقعوں پر دل چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بھی اپنے بیڈ پر تکیے میں منہ چھپا کے روتی سسکتی کہ وہ یہ سب آخر کیسے برداشت کرے گی۔ لوگوں کے طنزیہ فقرے اس کے دل میں تیر کی طرح لگتے۔ لوگ اُس کی حالت دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتے تو وہ حیران رہ جاتی۔ پھر بھی ترس کھاتے الفاظ ہائے بے چاری کو نظر لگ گئی سن کر اُس کا پورا جسم کانپ جاتا۔

لیکن ان سب کے باوجود یہ بلند ہمت لڑکی مظلوم بننے کی بجائے مثال بننے کا فیصلہ کرتی ہے۔ زمین پر رینگنے کی بجائے آسمانوں پر اُڑنے کا اور زندگی کی ہر مشکل کو مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ خود ترسی کے بجائے خود یقینی کا فیصلہ، آگے بڑھنے کا عزم اور کچھ کر گزرنے کا عزم اور اس زندگی کے دوبارہ ملنے اور اس کا قرض اتارنے کا عزم۔ منیبہ نے دوسروں کی طرح ہمت نہ چھوڑی اور لحاف میں لپٹ کر رونے سے محنت کرنے بہتر کو جانا۔ ان کے بقول:

> ''زندگی میں ایسے بہت سے لمحات آتے ہیں جب آپ سوچتے ہیں کہ زندگی نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ لیکن، پھر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کتنے خوش نصیب بھی ہیں۔ جتنا زیادہ آپ اندر سے ٹوٹتے ہیں، اتنا ہی آپ دل اور دماغ کے اعتبار سے مضبوط ہوتے جاتے ہیں''۔

وہ پھر سے بھرپور جی لینے کے عزم کو اپنے ہسپتال کے بیڈ سے شروع کرتی ہے اور سب سے پہلے اپنی زندگی کی خوبصورتی نکھارنے کے لیے پینٹنگ کا آغاز کرتی ہے۔ دو سال کے تکلیف دہ قیام کے بعد جب وہ اس ہسپتال سے رخصت ہوتی ہے تو ایک اور ساتھی ویل چیر کی شکل میں اس کی ہمسفر ہے۔ ہمیشہ کی ہمسفر۔۔۔

اکثر آپ بری سے بری صورت حال کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو جائیں اور ایسے میں اگر آپ کو کسی اپنے کا بھرپور ساتھ بھی میسر آ جائے تو مشکلات کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور مشکل

حالات میں اپنوں کا ساتھ بہت بڑی نعمت ہے جو آپ کا حوصلہ ٹوٹنے نہیں دیتا۔ لیکن قسمت نے ابھی اس ہیرے کو مزید تراشنا تھا۔

20 سال کی عمر میں جب منیبہ زندہ دلی کے ساتھ جینے کا عزم کر لیتی ہے زندگی اُسے دکھ اور حیرت کا ایک اور جھٹکا دیتی ہے۔ اس کی زندگی کا سب سے قریبی ساتھی اس کا ہمسفر اسے معذور سمجھتے ہوئے طلاق دے دیتا ہے۔ لیکن یہ حادثہ دوبارہ اُس کا حوصلہ پست کرنے اور مایوسی کے گرداب میں پھنسانے میں ناکام رہا۔ وہ جینا چاہتی ہے اور اس مشکل وقت میں اپنے والد کی طرف دیکھتی ہے۔ لیکن ایک اور حیرانی سے بھرپور دکھ اس کا منتظر ہے۔ اس کے والد بھی اس تکلیف دہ وقت میں انہیں اکیلا چھوڑ جاتے ہیں۔ زندگی کے مشکل ترین دو سال ہسپتال میں اور اُس کے بعد اپنوں کے ایسے بیگانے چہرے! وہ حیران ہے کہ زندگی آخر اُس سے کیا چاہتی ہے۔

آپ میں حوصلہ ہو تو امید کی ساری کرنیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ اُس کی والدہ، بھائی اور ڈاکٹر اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ حادثہ کے بعد منیبہ کے دل میں اپنی مدد آپ کا جذبہ بیدار ہوا۔ منیبہ کو احساس تھا کہ اور بھی لوگ اس کے ساتھ اسکی مسکان سے جیتے ہیں۔ وہ کام کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں اور سب سے پہلے انہیں ایک رائٹر کی نوکری انٹرنیٹ کے ذریعے مل جاتی ہے۔ جس سے اُن کے روزگار کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دن ٹی وی پر اشتہار میں دیکھتی ہیں کہ اگر آپ اپنے بچوں کو پولیو قطرے نہیں پلائیں گے تو آپ کے بچے بھی معذور ہو جائیں گے اس ایڈ نے منیبہ کے اندر تک وار کیا۔ تب ہی منیبہ نے ارادہ کیا کہ میں اس سوچ کو بدلوں گی اور انہوں نے یہ پیغام دیا کہ "تم جہاں بھی ہو تمہیں خوش ہونا چاہیے تم ہر مقام پر اور ہر حالت میں بہت کچھ کر سکتے ہو۔ اگر میرا آدھا جسم کام نہیں کر رہا تو کیا ہوا میرے بازو ہیں۔ آنکھیں ہیں دماغ ہے سوچ سکتی ہوں" میں کیوں ایک بے بسی کی تصویر بنوں؟ مجھے ایک مثال قائم کرنی ہے کہ جو لوگ محروم ہیں وہ لاچاری اور بے بسی پر محنت کو ترجیح دیں۔ وہ کہتیں ہیں اگر آپ اُداس نہ ہوں ہر وقت شکوہ شکایت نہ کریں تو لوگ آپ سے دور نہیں بھاگیں گے۔ آپ کے قریب رہنا پسند کریں گے۔ اپنا رونا اور دکھ اللہ کے لیے بچا کر رکھیں۔

وہ کہتیں ہیں کام کرنے والوں کے پاس تو بہانوں کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔
آپ اللہ کی ذات پر ہر حال میں کامل یقین رکھیں کیوں کہ روزی رساں تو وہ ہے یقینا کامیابی آپ کا مقدر ہو گی۔

منیبہ کا ایک قول ہے:

''زندگی میرے ہاتھ میں ہے جیسی ہے مجھے گزارنی ہے مجھے کسی معجزے کا انتظار نہیں کرنا کہ میں کسی دن چل سکوں گی مجھے مضبوط بننا ہے''

ہمارے یہ بہانے بالکل احمقانہ ہیں کہ یہاں کچھ کر نہیں سکتے کوئی کرنے نہیں دے گا۔آپ اندازہ کریں وہ ہسپتال کے بیڈ پر کام شروع کرتی ہے۔اس کی ساری پینٹنگز گورنر پنجاب خرید لیتا ہے اور اُس کے حوصلے مزید مضبوط ہونے لگتے ہیں۔وہ اپنی تکلیفوں کا الزام حالات یا کسی بھی اور کو دینے کی بجائے دوسروں کے کام آنے اور اُن کے حوصلے بڑھانے کا فیصلہ کرتی ہے۔وہ صحت مند انسانوں کی طرح چل پھر نہیں سکتی۔لیکن،جسمانی طور پر صحت مند انسانوں سے کہیں بڑھ کر مثبت انداز کی سوچ رکھتی ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ پاکستان میں مسائل تو ہیں اور ان کے حل کے لئے کام بھی کیا جا رہا ہے لیکن جس دن ہم نے دوسرے انسانوں کو اپنے جیسا انسان سمجھنا شروع کر دیا،ہمارے معاشرے کے تمام مسائل خود ہی ختم ہو جائیں گے اور ہماری دنیا رہنے کے لئے ایک بہترین جگہ بن جائے گی۔

منیبہ نہ صرف اپنی زندگی کو خوبصورت بنانے بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے میں کامیاب ہو رہیں ہیں۔وہ ایک جگہ کہتی ہیں زندگی میں مجھے تین طرح کے لوگ ملے۔ایک وہ جنہوں نے مجھے ویل چیر پر دیکھا اور میرا مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور میری زندگی سے چلے گئے۔کچھ لوگ ایسے تھے جو دکھاوے کے ساتھی تھے۔وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ نہیں تھے۔آخری طرح کہ لوگ وہ تھے جو بغیر کچھ بولے،بغیر شور ڈالے میرے ساتھ کھڑے رہے۔

آج وہ ساری مشکلیں جھیل کر ایک بہترین آرٹسٹ،زبردست موٹیویشنل سپیکر،سماجی کارکن،ٹی وی اینکر ایک خوبصورت رول ماڈل اور نغمہ نگار ہیں۔وہ ایک اچھی لکھاری اور ایک اعلیٰ مصورہ کے طور پر بھی جانی جاتی ہیں۔

منیبہ مزاری اپنے ہر کام میں اعلیٰ مہارت رکھتی ہیں۔ منیبہ نہ صرف پاکستان کی پہلی ویل چیئر ماڈل ہیں بلکہ معروف برانڈ باڈی شاپ کی برانڈ ایمبیسڈر بھی ہیں۔ وہ گلوکاری بھی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسے اسکول کے ساتھ بھی کام کر رہی ہیں، جو ضرورت مند بچوں کو تعلیم دیتا ہے۔ منیبہ کئی سماجی کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔ ان کا نام فوربز میگزین کی سن 2016 کی 30 سال سے کم عمر اہم ترین شخصیات کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خواتین نے گزشتہ برس دسمبر میں منیبہ کو خیر سگالی کی سفیر مقرر کیا۔ وہ پہلی پاکستانی خاتون ہیں، جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔

منیبہ کی کہانی ہمیں سبق دیتی ہے کہ اگر وہ معذوری کے باوجود اپنے سارے خواب پورے کرسکتیں ہے۔ قابل رحم بننے کے بجائے روشن مثال بن سکتی ہے۔ تو آپ میں یہ حوصلہ کیوں نہیں ہے؟ ہم میں سے ہر ایک کامیابی کا طلب گار ہے۔ مگر ہمارے بہانے ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ منیبہ ان سب کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ آپ جیسے بھی حالات میں ہیں آپ زندگی میں کچھ کر کے دکھانا چاہتے ہیں کچھ بننا چاہتے ہیں تو آپ بن سکتے ہیں۔

دنیا میں ہمیں قسمت کا شکوہ کرنے اور رنگ رنگ کے بہانے تراشنے والے اکثریت میں ملتے ہیں۔ منیبہ ایسے لوگوں کے لیے کہتی ہے کہ اگر کچھ کرنا چاہو تو پہلے خود کو پہچانو۔ اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ میں یہ کرلوں یا وہ کرلوں تو آپ غلط راستے پر ہیں۔ خواب دیکھنے تو ہر فرد کو آتے ہیں۔ کیا آپ اپنے اندر ان خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا حوصلہ اور مستقل مزاجی کا جذبہ رکھتے ہیں؟ آپ حالات کا رونا تو نہیں روتے؟ تو آپ کامیاب ہوسکتے ہیں۔

ہمارے گردونواح میں اکثریت اپنی زندگی کے مقاصد سے غافل نظر آتی ہے کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کر کیا سکتا ہے اور اسے کرنا کیا چاہیے آپ دیکھیں آپ کے اندر پوٹینشل کس چیز کا ہے؟ ہمارے نوجوان اکثریت میں وہ کام کرتے ہیں جو وہ کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ایسی تعلیم حاصل کرنے میں لگے ہیں جن کا انہیں شوق ہی نہیں ہے۔ طالبعلموں سے یہی گزارش ہے کہ خود کو پہچانیں۔ زندگی کے حادثوں کا شکار ہر انسان کے لیے منیبہ ایک امید کی کرن ہیں ایک

رول ماڈل ہیں۔ منیبہ مزاری کی زندگی سے میں نے سیکھا ہے کہ:

"کامیابی ایک نظریہ اور سوچ کا نام ہے اگر آپ ٹھان لیں کے آپ نے گمنام نہیں مرنا تو ساری دنیا مل کر بھی آپ کو گمنام نہیں کر سکتی۔ آپ کی سوچ اور جذبے کو کوئی تکلیف اور حادثہ شکست نہیں دے سکتا"

✿✿✿

# ڈاکٹر فرزانہ سلیمان

## Dr Farzana Sulman

پاکستان کی پہلی نابینا پی ایچ ڈی ڈاکٹر کا اعزاز حاصل کرنے والی کراچی کی عظیم خاتون کی کہانی

وہ ہنستی مسکراتی پیاری سی بچی جب پیدا ہوئی تو مکمل صحت مند تھی۔ اُسکا بچپن اس لیے زیادہ خوبصورت تھا کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ مستقبل میں اُسے کن کن آزمائشوں سے گزر کر کامیابی کے زینے طے کرنے ہیں۔ پھر جب وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتی کودتی آٹھویں کلاس میں پہنچی تو ٹائیفائیڈ اُس کی آنکھوں کی روشنی چرا کر لے گیا اور ایک ہنستی مسکراتی خوبصورت زندگی کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ کچھ دن تو محرومی کے غم سے نکلنے میں لگے لیکن پھر جب حوصلے کے ساتھ جینے کا اور ہر مشکل کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اُن کے لیے کون اتنا وقت نکالے گا، وہ تعلیم کیسے جاری رکھ سکیں گی اور انھیں کون پڑھائے گا۔

پہلے کی طرح ان کے لیے اسکول جانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت

لوگوں کی رہنمائی اور حوصلے کی منتظر ہیں۔ اس کتاب کا مقصد محض آپ کو حقیقی کہانیوں سے روشناس کرانا نہیں بلکہ ان لوگوں کی قابلیت کا احساس دلانا بھی ہے۔ تاکہ اگر کل آپ کسی ایسے فرد کو دیکھیں جو فقط اپنی کسی چھوٹی سے کمی کی وجہ سے دل چھوٹا کیے ہوئے بیٹھا ہو، آپ اُس کا حوصلہ بن جائیں۔ آپ اگر زندگی میں کہیں رُک گئے ہیں یا حوصلہ چھوڑ رہیں ہیں تو یہ سب لوگ آپ کی ہمت بڑھانے کے لیے ہیں۔ ان کی کامیابیاں آپ کو احساس دلائیں گئیں کہ جب زندگی میں کچھ بھی کرنے کی ٹھان لی جائے تو کمزوریاں بھی طاقت بن جایا کرتی ہیں۔

امید ہے کہ آپ زندگی میں ہرگز گمنام مرنا پسند نہیں کریں گے۔ آپ نہ صرف خود کامیاب ہوں گے بلکہ اس دنیا کو بھی بہت کچھ دے کر جائیں گے۔ جینا سیکھیں گے اور سکھائیں گے۔ آگے بڑھیں منزلیں آپ کی منتظر ہیں۔

عزیزہ سعید کی زندگی سے میں نے سیکھا ہے کہ۔

''جن لوگوں کی زندگی میں مشکلات نہیں ہوتی وہ کبھی کامیابی کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتے''

❁❁❁

# ڈاکٹر شاہدہ رسول

## Dr Shahida Rasool

9 سال تک سکول سے محروم اور گھر میں بند رہنے والی گاؤں کی نابینا لڑکی کیسے پی۔ایچ۔ڈی ڈاکٹر بن گئی۔

ملتان کے نواحی علاقہ جلالپور پیروالہ کے گاؤں میں پیدا ہونے والی ''شاہدہ رسول''، جس کی ابھی آنکھیں روشنی سے مانوس بھی نہ ہوئیں تھی کہ تین ماہ کی عمر میں ٹائیفائیڈ کی وجہ سے ''ریٹنا'' متاثر ہوا اور بینائی چلی گئی۔ کچھ عرصہ تک پریشانی گزارنے کے بعد گھر والے اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر مطمئن ہو گئے۔ چونکہ گاؤں کے لوگ تھے، اس لیے بچی کے لیے دستیاب خصوصی تعلیم سے بھی خاص آگاہی نہ تھی، لہٰذا جب باقی بہن بھائیوں کو سکول میں داخل کروایا گیا تو شاہدہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ اُس وقت نابینا بچیاں گھروں تک ہی محدود رہا کرتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا اور یہ بچی اپنی دیواروں میں قیدرہ کے 9 سال کی ہوگئی لیکن تعلیم سے

دوری کے باعث آنکھوں کے بعد دماغ کو بھی روشنی نصیب نہ ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب اکثر جاہل لوگ ایسی معذوری کو اللہ کا عذاب خیال کرتے تھے۔ "شاہدہ" کے گھر والے بھی یہی سمجھتے تھے کہ اُس کا مقدر اسی طرح اندھیروں میں بھٹکتے رہنا اور لوگوں کے طعن و تشنیع سنتے رہنا ہے۔ اُسے بالکل "اچھوت" بنا کر رکھ دیا گیا۔ جب اُس کے گھر مہمان آتے تو اُسے انہیں ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اُس کا ننھا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ ایسا کر کے اُسے کسی تکلیف سے بچاتے ہیں یا پھر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ باقی سب کتنے مکمل اور وہ کتنی ادھوری ہے۔ بقول شاعر

کبھی سمجھتے ہیں مرجھایا ہوا پھول مجھ کو
کہتے ہیں اہل محفل رونق محفل نہیں میں

پھر شاید اُس کی ذہنی اذیت اور تنہائی کو دیکھتے ہوئے خدا نے اُس پر اپنا خصوصی کرم کیا اور ان کے گھر والوں کو خبر ہوئی کہ وہ نابینا ہوتے ہوئے بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ لہٰذا 1991 میں نو سال کی عمر میں "محمد بن قاسم بلائنڈ ویلفیئر اسکول" ملتان میں پہلی کلاس میں داخلہ دلا دیا گیا۔ اُسے پڑھنے کی خواہش تو تھی ہی اور اساتذہ کا تعاون بھی شامل ہو گیا۔ یہ سکول گویا اُس کے لیے نئی دنیا ثابت ہوا۔ اُسے سکول سے اور تعلیم سے محبت ہو گئی اور اُس نے ہر سال میں دو کلاسز پاس کرنا شروع کر دیں۔ اُس کے بہن بھائی جب اپنا سبق اونچی آواز سے دہراتے تو وہ بہت سی چیزیں یاد کر لیتی۔ اس طرح سے دیر سے سکول داخل ہونے کا جو خلا تھا وہ پُر ہونے لگا۔

وہ ہونہار تھی اور محنتی بھی اس لیے وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لینے لگی۔ تقریر کرنا، ڈراموں میں شمولیت، مضمون نویسی اور گلوکاری ہر چیز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ اساتذہ کی خصوصی توجہ نے اُسے مزید نکھار دیا۔ مڈل تک تعلیم اُس نے خصوصی اداروں سے حاصل کی۔ اور پھر اپنی قابلیت کی بنا پر وہ نارمل سکولز میں جانا شروع ہو گی۔ 1998 میں اس نابینا بچی نے میٹرک میں ٹاپ کر کے ہر کسی کو حیران کر دیا۔

پھر وہ مزید آگے بڑھیں اور گورنمنٹ ڈگری کالج ملتان میں داخل ہو گئیں۔ یہاں سے اُنہوں نے انٹرمیڈیٹ اسلامیات میں جبکہ بی۔اے اُردو ادب میں مکمل کیا۔ یہاں بھی اساتذہ نے اُس کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور وہ ایم اے کرنے کے لیے بہاو الدین زکریا

یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔ یہاں بھی اُس نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔

یہاں بھی وہ رکی نہیں تھکی نہیں اُنہوں نے علامہ اقبال کی شاعری پر ریسرچ کر کے اسی یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری بھی مکمل کر لی۔ شاہدہ رسول نے زکریا یونیورسٹی میں صرف پوزیشن ہی حاصل نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کا اعلیٰ نمبروں کا 16 سالہ ریکارڈ بھی توڑ دیا۔

یہ سارا راستہ مشکلات سے بھرپور تھا۔ ہاسٹل میں روم میٹس سے لے کر پک اینڈ ڈراپ تک کئی مشکل مراحل سے گزری، کئی دفعہ اُس کا حوصلہ توڑا گیا کہ وہ پڑھ کر کیا تیر مارلے گی۔ لیکن اساتذہ اور کچھ دوست مسلسل اُس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اُسے بھی سمجھ آ گئی تھی کہ تعلیم ہی کی روشنی سے سب دیکھنے کے قابل ہوگی۔ وہ جان گئی تھی کہ تعلیم ہی وہ چھڑی ہے جو آئندہ زندگی میں مسلسل سہارا دے سکتی ہے۔

شاہدہ رسول 2009 میں اپنی نوکری کے سلسلے میں اسلام آباد چلی گئی اور مارگلہ کالج اسلام آباد میں پڑھانا شروع کیا اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا ارادہ کیا۔ یہاں نوکری کے ساتھ پی ایچ ڈی جیسی مشکل ڈگری آسان نہیں تھی لیکن اس کی ہمت اور جذبے کو دیکھتے ہوئے یہاں بھی اساتذہ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اور آخر کار اس محنت اور جذبہ نے اس ثابت قدم لڑکی کو سرخرو کیا اور اُس گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی نے پی ایچ ڈی مکمل کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

آج کل وہ ملتان ویمن یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔ لیکن وہ اب بھی تھکی نہیں بلکہ پوسٹ ڈاکٹریٹ کا ارادہ رکھتی ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ بڑی منزلوں کی راہوں میں رکاوٹیں اور مشکلات بھی بڑی ہوتی ہیں لہٰذا وہ اب بھی بلند حوصلہ اور پختہ ارادے رکھتی ہیں۔

مستقبل میں وہ پوسٹ ڈاکٹریٹ کرنے کے علاوہ اپنی طالبات کے اندر بھی وہ حوصلہ اور جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہیں جسے انہوں نے کوششوں کے بعد خود میں دریافت کیا، وہ چاہتی ہیں کہ ان لوگوں کو ایک نئے حوصلے سے روشناس کروائیں، جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خود کو محروم سمجھتے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ "کوئی بھی شخص مکمل نہیں ہوتا۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہوتی ہے، کچھ نظر آتی ہیں کچھ پوشیدہ ہوتی ہیں، تو کسی بھی محرومی کو جواز بنا کر اپنی باقی

صلاحیتوں کو ضائع مت کریں''۔

آج بھی شاہدہ رسول جیسی کئی بیٹیاں تعلیم سے محروم گھروں میں محصور ہیں۔ان کے والدین کو بتایئے کہ ان بچوں کے لیے ہر جگہ خصوصی سکول موجود ہیں۔ جہاں یہ اپنی تعلیم سے اپنا مستقبل سنوار سکتی ہیں۔ان کا حوصلہ بنیے۔ایک بہت شاندار مستقبل ان کا منتظر ہے۔

شاہدہ رسول کی زندگی سے میں نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ:

**''کامیابی کا سفر ہمیشہ اندھیروں سے روشنیوں کی جانب ہوتا ہے''**

# ڈاکٹر صابر مائیکل

## Dr Sabir Michael

ایک غریب صفائی والے کا نابینا بیٹا کیسے "پی ایچ ڈی" ڈاکٹر بنا اور کیسے پوری دنیا میں جا کر اپنے لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔

معذوری اکثر لوگوں کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتی ہے۔ بڑے بڑے دل ایک بار تو کانپ کے رہ جاتے ہیں۔ پھر وہ لوگ جن کے گھر میں ایک سے زیادہ معذور بچے ہوں ان والدین کی راتیں اکثر کروٹیں بدلنے میں ہی کٹ جاتی ہیں، مستقبل کی بے یقینی اُن کا سکون چُرا لیتی ہے۔ یہ ایک ایسے ہی غریب گھرانے کی کہانی ہے جہاں تین بچے نابینا پیدا ہوئے۔ والدین بڑی مشکل سے سڑک پر صفائی کا کام کر کے گزر بسر کر پا رہے تھے۔ ان حالات میں تعلیم تو بہت دور کی بات ہے، انسان کے لیے دو وقت کی روٹی بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔
انہی مشکل ترین حالات میں پلنے والا ایک بچہ صابر تھا۔ جو 1978 میں کراچی میں

پیدا ہوا۔ جس میں آگے بڑھنے اور زندگی کو کارآمد بنانے کی لگن تھی۔ وہ کچھ کر گزرنے کے لیے ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ لیکن آنکھیں روشنی سے محروم تھیں۔ پھر ایک دن اس کی یہ لگن اسکی نن مس روز نے بھانپ لی۔ انہوں نے اُسے لے جا کر اوکاڑہ کے سکول فار بلائنڈ چلڈرن میں داخل کروا دیا۔ یوں سات برس کی عمر میں وہ کراچی سے اوکاڑہ چلا گیا۔ اُس نے خوب محنت سے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ اور پورے سکول میں اپنی پہچان بنائی۔ جب وہ نویں اور دسویں جماعت کے دور سے گزر رہا تھا تو اکثر اُس کے دوست ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی باتیں کرتے۔ تب وہ اپنی منزل سے ناآشنا تھا۔ وہ سوچا کرتا کہ وہ پڑھ لکھ کر کیا بنے گا۔

اُسے یہ فکر کبھی نہیں رہی کہ وہ غریب والدین کی اولاد ہے شاید وہ اس کی تعلیم جاری نہ رکھوا سکیں۔ وہ اگر کچھ سوچتا تھا تو یہ کہ اُس کی معذوری کے ساتھ اُس کے لیے کون سا شعبہ زیادہ مناسب رہے گا۔ اور پھر جب اُس نے میٹرک مکمل کر لیا تو وہ کراچی لوٹ گیا۔ اسکول کے دس سالوں نے اس کے اندر موجود شعور کی آنکھ کو بیدار کر دیا تھا۔ اُس کے جذبے میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ کچھ کر گزرنے کا جذبہ۔ کچھ پانے کا جذبہ۔ اپنے لوگوں کے لیے کچھ کر دکھانے کا جذبہ۔

پھر وہ کالج جانا شروع ہو گیا۔ اُس نے نیلسن منڈیلا کی تحریک کے بارے میں سنا تو اساتذہ سے فرمائش کر کے وہ نیلسن منڈیلا کی تقاریر کے ترجمے سنا کرتا۔ ان کی باتوں سے اُس نے بہت کچھ سیکھا اور اُسے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ وہ بھی ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ معذوری ہو، بینائی نہ ہو، معاشی حالات سخت خراب ہوں تو مسائل میں خود بخود بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اُسے بھی پڑھائی کے دوران بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ سکول و کالج آنے جانے کی مشکلات سے لے کر کتابوں کو خود بریل میں لکھنے تک بے شمار چیزیں اُسے اکثر بے بس کر دیتی تھی۔ لیکن وہ ہار ماننے والوں میں ہرگز نہیں تھا۔

اُسے اپنی کلاس کے دوستوں میں بھی کوئی لگن اور جذبے والا دوست نہ مل سکا۔ اکثریت سب کچھ حالات پر چھوڑے ہوئے تھی۔ مطالعہ نے اس کا شعور بڑھا دیا تھا۔ وہ اب اپنے سے زیادہ اپنی پوری کمیونٹی کے بارے میں سوچتا تھا۔ اُسے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ اُس کی کرسچن کمیونٹی میں رہنمائی کا شدید فقدان ہے۔ وہ جان گیا تھا کہ باقی ملکوں

میں کرسچن نے تعلیم کے ذریعے عزت اور مقام پایا ہے۔ اور تعلیم ہی ان کے معاشی حالات کو بہتر بنا سکتی ہے۔

یہ احساس بڑھتا چلا گیا اور وہ تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے کالج سے یونیورسٹی پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے انہی حالات اور اُسی معذوری کے ساتھ نہ صرف گریجویشن، ماسٹرز اور ایم فل کیا بلکہ پی ایچ ڈی میں بھی پہنچ گیا۔ اُس نے اسی بات پر اپنی ریسرچ مکمل کی کہ معاشرے میں کرسچن اقلیت کس طرح اپنی معاشی صورتحال کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی اقلیتی کمیونٹی سے اقلیتوں کے سماجی و معاشی مسائل پر ریسرچ کے بعد ایسا ''مقالہ'' جمع کروایا گیا۔ اقلیتوں پر اب تک جتنا بھی کام ہوا تھا، وہ ان کے انسانی حقوق کے حوالے سے ہوا تھا۔ یہ ''سہرا'' بھی صابر کے سر جاتا ہے۔

28 سال کی عمر میں ''صابر'' نے غربت کی انتہائی لکیر پر رہتے ہوئے اپنی بے نور آنکھوں کے باوجود 2006 میں کراچی یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی مکمل کر لی۔

صابر آج ''ریسرچ ایڈوکیسی اینڈ سوشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ'' کا صدر ہے۔ وہ اپنا مقالہ پڑھنے سب سے پہلے انگلینڈ گیا، اس کے بعد وہ خصوصی ٹریننگ کے لیے جینوا، سوئزرلینڈ چلا گیا۔ 2011 میں اس نے برابری کے حقوق پر کینیڈا سے ٹریننگ حاصل کی۔ وہ اپنی ریسرچ کے سلسلے میں کینیڈا، اٹلی، انگلینڈ، ملائیشیا، سوئزرلینڈ اور فرانس کے سفر کر چکا ہے اور ساری دنیا میں اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ پاکستان کے تقریباً تمام ٹی وی چینلز اور ریڈیو سٹیشن پر آ کر اپنے لوگوں کی نمائندگی کرتا رہتا ہے۔ وہ بے شمار تنظیموں کا ایگزیکٹیو ممبر اور رکن کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

''صابر مائیکل'' پاکستان کی ایک زندہ اور روشن مثال ہے، جس نے غربت اور معذوری کا جواں مردی سے مقابلہ کیا اور اپنے خاندان کے ساتھ اپنی پوری کمیونٹی کا ہیرو بنا۔ آج کل وہ کراچی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے اور اس پیارے وطن کے لیے ایک روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں

ڈاکٹر صابر کی کہانی میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اگر آپ ایمانداری سے اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈنا چاہیں تو آج کل کے بے شمار نوجوانوں کے لیے جواب اس میں

موجود ہیں۔ آپ انتہائی غریب ہیں؟ آپ کا کوئی سوشل سٹیٹس نہیں ہے؟ گھر میں تنگ دستی کے ساتھ معذوری نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ آپ اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں جانتے لیکن اس سب کے باوجود بھی آپ کے لیے کامیابی ممکن ہے شرط اتنی ہے کہ آپ مایوس انسان نہ ہوں۔ آپ عہد کرلیں کہ آپ نے حالات کا مقابلہ کرنا ہے فتح یقیناً آپ کا مقدر ہوگی۔۔ڈاکٹر صابر کی کہانی یہ ثابت کرتی ہے کہ:

**"جب مقصد واضح ہو جائے تو منزلیں آپ کی منتظر رہتی ہیں۔ وہ آپ سے آپ کی ذات اور حالات نہیں پوچھتیں۔ وہ فقط آپ کے جذبے اور ہمت کو قبول کرتی ہیں"**

❁❁❁

## سید سردار احمد پیرزادہ

## Syed Sardar Ahmad

### پاکستان کے پہلے نابینا صحافی کی لازوال کامیابیوں کی عظیم داستان

پاکستان میں کسی معذوری کے باوجود کامیابیوں کی رسم ڈالنے والے اور نئے شعبوں میں داخل ہونے والی شخصیات کا نام آئے تو "سید سردار احمد پیرزادہ" کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ جو پچھلے کئی سالوں سے بغیر تھکے اس ملک کے لوگوں کے لیے آگاہی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ یہ کہانی ہے ایک ایسے عظیم شخص کی جو ہر روز نئی محبتیں اور نئے حوصلے بانٹتا ہے۔ سید سردار احمد پیرزادہ اردو زبان میں پاکستان کا پہلا نابینا صحافی ہے۔ وہ دانشور، تجزیہ و کالم نگار، ایڈیٹر اور ریڈیو، ٹی وی کے اینکر پرسن بھی ہے۔

پیرزادہ صاحب جوہر آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے عام سکولوں سے تعلیم حاصل کی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ انہوں نے کالج تک کی تعلیم

بھی جوہر آباد سے مکمل کی۔ کالج میں سردار صاحب نہ صرف اپنی کلاس کے مانیٹر، تھے بلکہ یونین کے صدر، ایڈیٹر، اقبال سوسائٹی کے سیکرٹری اور سوشل ورک سوسائٹی کے صدر بھی تھے۔ 1986 میں پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم میں اعلیٰ نمبروں سے گریجویشن کو مکمل کیا۔ اور جرنلزم کو باقاعدہ کیریر کے طور پر اپنالیا۔ آپ نے روزنامہ جنگ، جسارت، مشرق، نوائے وقت اور ہفتہ وار استقبال جیسے اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ اور آپ انگریزی ماہنامہ کے بھی ایڈیٹر بنے۔ 1988 میں نیشنل لینگویج سوسائٹی کے پبلک ریلیشن آفیسر منتخب ہوئے۔ 2003 سے لے کر 2010 تک اردو زبان کے ایڈیٹر بھی رہے۔

اپنی محنت اور تجربہ کی بنیاد پر انہوں نے 2001 میں ایک تنظیم بنائی جسکا نام ریسرچ اینڈ انفارمیشن امپوریم رکھا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک مختلف تنظیم تھی جس میں نہایت قابل لوگوں کا انتخاب کیا گیا۔ جنہوں نے دن رات کی محنت سے اس کو اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

"سید سردار احمد" کے سامنے کوئی رول ماڈل ایسا نہیں تھا۔ جو نابینا ہونے کے باوجود اس شعبہ میں آیا ہو۔ آپ پاکستان کے پہلے جرنلسٹ ہیں جو باقاعدہ تعلیم مکمل کر کے اس شعبہ میں آئے۔ شروع میں لوگوں نے انہیں اس شعبہ میں تسلیم کرنے میں مزاحمت دکھائی لیکن اپنی قابلیت اور محنت کے بل بوتے پر بہت جلد انہوں نے اپنی پہچان خود بنائی۔ اور اپنی کارکردگی ہی کی بنا پر ہر جگہ خود کو تسلیم کروایا۔

آپ روزنامہ نوائے وقت میں باقاعدگی سے ملکی اور عالمی مسائل پر لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ریڈیو اور ٹی وی کے اینکر پرسن کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔ لوگوں سے بات چیت کا شوق اُنہیں بچپن سے ہے اور اس شوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ مختلف اداروں میں لیکچر بھی دیتے ہیں۔

ان کی زندگی کی کہانی بے شمار نشیب وفراز پر مشتمل ہے لیکن اُن کی محنت اور مستقل مزاجی نے انہیں ہزاروں مشکلات کے باوجود پاکستان کے اعلیٰ درجے کے جرنلسٹ میں لا کھڑا کیا ہے۔ بینائی سے محرومی کو انہوں نے کبھی اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ان کے بارے میں مشہور کالم نگار جاوید چوہدری لکھتے ہیں۔

"پیرزادہ صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے مجھے کالم لکھنے کی ترغیب دی، وہ

میری راہنمائی بھی کرتے تھے اور حوصلہ افزائی بھی۔ میں آج کالم نگار ہوں تو اس کی پہلی اینٹ اللہ تعالیٰ کے بعد سردار پیرزادہ نے رکھی تھی"۔

وہ نہ صرف اپنے شعبے میں کامیاب رہے بلکہ اپنے رفاہی کاموں کی وجہ سے بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔ اپنے جیسے افراد کی مدد کے لیے وہ ہر وقت پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ خصوصی افراد کے حقوق کی جنگ کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ان سے متعلق آگاہی پیدا کرنے میں بھی بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ آپ بے شمار تنظیموں کے ممبر ہیں اور خصوصی افراد کی پارلیمنٹ میں نمائندگی کے لیے بھی کام کر رہے ہیں۔ خصوصی افراد کی فلاح و بہبود کے لیے بھرپور عملی کوششوں کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔

آپ اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے 2012 میں صدر پاکستان کی طرف سے خصوصی ایوارڈ بھی دیا گیا اور آپ بہترین کالم نگار کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کو چولستان ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ آپ کو 2013 میں پاکستان کی ہردلعزیز شخصیت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی طرف سے بھی گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ ملکی سطح پر بے شمار اعزازت اپنے نام کرنے میں کامیاب رہے۔

جاوید چوہدری ان کے بارے میں مزید لکھتے ہیں

"یہ پاکستان کے پہلے "بلائنڈ کالمسٹ" ہیں اور میں یہ تسلیم کرتے ہوئے پیرزادہ صاحب سے شدید حسد محسوس کر رہا ہوں کہ ان کا کالم ہم جیسے عقل کے اندھوں سے کہیں بہتر، شاندار اور مضبوط ہوتا ہے، پیرزادہ صاحب کے کالم کی مضبوطی کی وجہ ان کا ان تھک جذبہ، ناقابل شکست ارادہ اور ہار نہ ماننے کا فیصلہ ہے جبکہ ان کے مقابلے میں ہم عقل کے اندھے اکثر اوقات اپنے ٹوٹتے جڑتے ارادوں، اپنے ہار مانتے سمجھوتوں اور اپنے جذبوں کی تھکان کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں جس وجہ سے ہمارے کالم پھیکے اور ہماری تحریریں بے روح ہو جاتی ہیں، ہمارے مقابلے میں پیرزادہ صاحب زیادہ مضبوط اور زیادہ ٹھوس ہیں چنانچہ ان کے کالم کی آن، شان اور بان ہر حال میں قائم رہتی ہے"

پیرزادہ صاحب کی زندگی بے شمار لوگوں کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔

جب صحافت جیسے مشکل شعبہ میں آنے والے لوگ دل چھوڑنے لگتے ہیں، مایوس ہونے لگتے ہیں تو پیرزادہ صاحب جیسے لوگوں کو دیکھ کر وہ پھر سے حوصلہ پکڑنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ آپ بے شمار لوگوں کے لیے امید کا سورج بنے ہوئے ہیں۔اب فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ ''سید سردار احمد'' کی طرح مشکلوں کا مقابلہ کرنا ہے یا پھر منہ چھپا کر ایک مایوس زندگی گزارنی ہے۔بے شک وہ نئے راستوں کے مسافروں کے لیے زندہ مثال ہیں۔آیئے ناممکن سے ممکن کی جانب سفر کا آغاز کریں۔

**''یقین مانیں! ساری دنیا مل کر بھی آپ سے آپ کی محنت کا صلہ نہیں چھین سکتی''**

❀❀❀

# امر خان

## Amar Khan

ایک ایسا بے بس جسم، جو معذوری کے باوجود جگمگاتا رہا، اور بالآخر عزت اور شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔

یہ 18 اکتوبر کی صبح تھی۔ سردیوں کا آغاز تھا اور موسم میں تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ امر خان بھی آج پھر نئے جذبوں کے ساتھ سکول پہنچا تھا۔ وہ حیات آباد پشاور کے ایک مشہور سکول میں زیر تعلیم تھا۔ وہ اپنی محنت سے نویں کلاس تک پہنچ گیا تھا۔ اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ آج کے مسائل عارضی ہیں۔ آج کی مشکلات ہی کل کو میری زندگی میں آسانیاں پیدا کریں گی۔ اپنی بھاری بھرکم "ویل چیئر" کے ساتھ چھوٹے قد کا سفر اس کے لیے روز ہی مشکل ترین سفر ثابت ہوتا تھا۔ اکثر وہ بڑی بے بسی محسوس کرتا۔ اُسے اپنی زندگی دنیا کی مشکل ترین زندگی محسوس ہوتی۔ اُس کے دل میں بھی خیال آتا کہ بس کر دے۔ لیکن کچھ کرنے کی تمنا کچھ

بن کے دکھانے کا جنون اُسے حوصلہ دیتا۔ یہ جذبہ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتا اور وہ مضبوط ارادوں اور بلند حوصلے سے دل میں دہراتا۔

''جینا ہے اور جی کے دکھانا ہے''

وہ ابھی اپنے خیالوں پر مُسکرانے ہی لگا تھا کہ یکدم چونکا۔ ہر کوئی حواس باختہ ہو کر باہر کو بھاگ رہا تھا۔ اور جب تک اُسے یہ بات سمجھ آئی کہ یہ شدید زلزلہ ہے۔ وہ سکول کی اس چھٹی منزل پر اکیلا رہ چکا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اللہ کو پکارنے لگا۔ اور اسی کشمکش میں اُسے بچپن کا وہ دن یاد آیا جب وہ اپنے پاوں بیڈ سے لٹکا کر بیٹھا تھا۔ اور نچلا دھڑ بے حس ہونے کی وجہ سے وہ جان ہی نہیں پایا تھا کہ کب اُس کے پاوں کے تلوے مکمل جل گئے تھے۔

اچانک دوسرا شدید جھٹکا لگا اور اسے محسوس ہوا وہ عمارت سمیت زمین بوس ہو جائے گا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جینا چاہتا تھا۔ اور بے پناہ مشکلات کے باوجود دنیا کو کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ اُس نے اس چھوٹی سی عمر میں بے شمار خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے۔ اُس نے سوچا اگر آج میں بچ گیا تو یقیناً کسی بڑے مقصد کے لیے ہی بچایا جاوں گا۔

اللہ نے اُس کے عزم اور ولولے کے طفیل ہی شاید اُسے نئی زندگی دی۔ جس زلزلہ میں لاکھوں لوگ زندگی گنوا بیٹھے وہ ویل چیر پر بھی محفوظ رہا تھا۔ اس حادثے نے اُس کے حوصلے مزید بلند کیے اور اُس نے دوگنی محنت شروع کر دی۔ میٹرک تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد اُسے پشاور کے مشہور ''کنگ ایڈورڈ کالج'' میں داخلہ مل گیا۔ جہاں اُسے حوصلہ دینے والے دوستوں کا ساتھ بھی ملا اور بہترین اساتذہ بھی اور اس بلند حوصلہ لڑکے نے بھی کالج کے دو سالوں میں ثابت کیا کہ وہ قابلیت اور ذہانت میں کسی سے بھی کم نہیں ہے۔

پشاور یونیورسٹی میں اُس کا پہلا دن لوگوں کو ملتے ہوئے اور تعارف کراتے گزر گیا۔ وہ سب کی نظریں پہچانتا تھا۔ اُسے ہر احساس کی پہچان تھی۔ وہ حیران تھا کہ یونیورسٹی لیول پر بھی وہی سکول لیول کی مشکلات اُس کی منتظر تھیں۔ اُس کی پہلی ہی کلاس دوسری منزل پر تھی۔ اور سیڑھیاں پھر سے اُس کی ویل چیر کا منہ چڑا رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر کیوں معاشرہ خود

رکاوٹ میں کمزوری کرتا ہے۔ اگر یہ لوگوں کے لیے سیڑھیاں بنا سکتا ہے تو ہمارے لیے "رکاوٹ" کیوں نہیں ۔لیکن یہ سب وقتی خیالات تھے۔ اس نے اپنا وقت ایسی چیزوں میں برباد نہیں کرنا تھا کہ آخر کیوں؟ اور کس وجہ سے؟

اس نے عہد کیا کہ وہ فقط "کیسے" پر کام کرے گا۔ ہر چیز پہ پریشان ہونے کے بجائے اپنا وقت اس کا حل تلاش کرنے میں صرف کرے گا۔ اور اسی مثبت رویے نے چند ہی دنوں میں اسے سب کا گرویدہ بنا دیا اور وہ بی ایس ٹیکنالوجی مکمل کرنے کا بعد ایم بی اے کرنے میں بھی کامیاب رہا۔

اب قسمت نے اُسے اس کی محنت کا صلہ دینا شروع کیا۔ اور بالآخر وہ بڑی تیز رفتاری سے کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ وہ میرٹ پر کے پی کے نیشنل یوتھ اسمبلی کا ممبر بنا۔ اور اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے بہت جلد اُسے یوتھ منسٹر برائے خصوصی افراد بنا دیا گیا۔ اور پھر کچھ ہی عرصے کے بعد اپنی قابلیت کا لوہا منواتے ہوئے سینکڑوں افراد سے مقابلے کے بعد وہ نیشنل یوتھ اسمبلی کا گورنر منتخب ہوا۔

امر خان آج کے پی کے کی ہر یونیورسٹی میں خصوصی مقرر کی حیثیت سے جاتا ہے لوگ اس کی کامیابی کی کہانی جان کر اپنے اندر نیا جوش اور ولولہ محسوس کرتے ہیں۔ امر خان کو بے شمار اعزازات سے نوازا گیا۔ انہیں ہیلتھ فاونڈیشن کے پی کے کی جانب سے گولڈ میڈل دیا گیا۔ نیشنل بک فاونڈیشن کی جانب سے ینگ بک ایمبیسڈر کا ایوارڈ دیا گیا۔ سنٹر فار اویرنیس ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کی جانب سے یوتھ ایمبیسڈر کا ایوارڈ۔ ایپری سیشن ایوارڈ فرام نیشنل یوتھ اسمبلی۔ خیبر سٹار پیس ایوارڈ

آج امر خان اپنے والدین کے لیے باعث فخر ہے۔ اور وہ سینہ تان کر بتاتے ہیں کہ یہ ہمارا بیٹا ہے۔ آج لوگ اس کی معذوری کو نہیں اس کی کامیابیوں کو جانتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کیسے ایک بے بس بچہ اپنی معذوری سے جنگ لڑتے عزت اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچا۔ آپ اُس کی ہمت اور حوصلے کی اگر داد نہیں دے سکتے تو کوئی بات نہیں لیکن آپ اُس کی زندگی سے سبق لے اور دے تو سکتے ہیں۔

دنیا میں آگے بڑھنے والے ہر انسان کی راہ میں لاتعداد مشکلیں آتی ہیں۔ لیکن

منزل واضح ہو تو حوصلے بلند رہتے ہیں اور جب حوصلے نہ ٹوٹیں تو منزلیں یقینی ہوتی ہیں۔ آیئے کبھی حوصلہ نہ ٹوٹنے کا عہد کریں۔ آئیں عہد کریں حوصلہ بنیں گے، امید بنیں گے اور اپنی زندگی میں ہمیشہ آسانیاں بانٹیں گے۔ اس وطن کے بے شمار بچوں کو ابھی امر ہونا ہے۔ جس طرح امر خان نے عظیم کامیابی کا سفر ناممکن سے ممکن کی جانب کیا تھا اُسی طرح یہ سفر آپ کے قدموں کا منتظر ہے۔

"جب تک آپ کو خود جینا نہیں آتا آپ جینے کا ہنر نہیں سیکھا سکتے"

✿✿✿

# سلیمان ارشد

## Sulman Arshad

اپنے خوابوں کو پانے کے لیے اپنوں سے دور ہو جانے والا سلیمان کیسے قومی ہیرو بنا۔

وہ لڑکا جو بند آنکھوں سے خواب دیکھتا تھا۔ اُس کے خوابوں میں جنون تھا اُس کے خیالات منفیت سے پاک تھے۔ وہ دسمبر 1992 میں ایک مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہونے والا اپنی فیملی میں پہلا نابینا لڑکا تھا۔ نابینا ہونے کا غم اس سے زیادہ اُس کے گھر والوں کے لیے خوفناک تھا۔ وہ اُس کے مستقبل کو ایک بھیانک خواب کی طرح دیکھتے تھے۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی تھوڑی بہت دیکھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس محرومی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس کے اساتذہ کا رویہ بھی بہت خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اُس کے بورڈ پر سے نہ پڑھ پانے کی محرومی کو مذاق سمجھتے تھے۔ وہ لوگوں کے رویوں سے ڈسٹرب ہو کر سب سے دور ہونے لگا۔ اُسے گروپ میں

ہنسنا اور ہنسی مذاق بہت پسند تھا لیکن لوگوں کے برتاؤ نے اُس سے سب چھین لیا۔ وہ محفلوں سے دور بھاگنے لگا۔ گھر میں کوئی پروگرام ہوتا تو وہ باہر بھاگ جاتا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر جب ساتویں کلاس میں وہ اپنی نظر بالکل کھو بیٹھا تو اُسے اپنا سکول بھی چھوڑنا پڑا۔ اسلام آباد جیسے بڑے شہر میں نابینا ہونے کا ایک فائدہ اُسے یہ ہوا کہ اُس کے والدین خصوصی تعلیم کے اداروں سے آگاہ تھے۔

وہ دوستوں کے طعنے، اساتذہ کا رویہ اور زندگی بھر کی محرومی کو سمیٹ کر المکتوم سپیشل ایجوکیشن سنٹر میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے اُس نے باقی نابینا افراد کے ساتھ میٹرک کر لیا۔ یہ وہ سکول تھا جس میں اُس کے محرومی کے باوجود حوصلے بلند ہونے لگے۔ وہ خواب دیکھنے لگا۔ وہ اپنی محرومی کو اپنے خوابوں کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ کچھ الگ سے کر دکھانے کا جنون دن بدن بڑھتا رہا۔

وہ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ کر کچھ بھی حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سکول سے نکل کر ایک دفعہ پھر اُسے اپنے لیے تعلیم کے دروازے بند ہوتے نظر آئے لیکن وہ رکنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اُس نے انٹرمیڈیٹ کے لیے ایک جنرل کالج میں داخلہ لے لیا اور مشکلات کے باوجود آگے بڑھنے لگا۔ کالج سے اُس نے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اُسے بڑے عجیب تجربات سے گزرنا پڑا۔ پڑھائی تو وہ عام افراد کے ساتھ کر ہی لیتا لیکن جب بھی ٹیسٹ ہوتا اساتذہ اُسے الگ بٹھا دیتے کہ تم کیا کرو گے ٹیسٹ دے کر۔

اکثر لوگوں کا رویہ اور طعنے اسے شدید کرب میں مبتلا کر دیتے وہ کسی کونے میں جا کے رو لیتا اور پھر کچھ کر دکھانے کا جذبہ اُسے دوبارہ سے امید اور یقین دلاتا کہ تمھاری زندگی کا کوئی مقصد ہے اسے ضائع ہرگز نہیں کرنا۔ وہ خود کو اور مضبوط کرنے لگا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ فقط مثبت پہلو دیکھے گا۔ اور مسکرا کے ہر مشکل اور تکلیف کا مقابلہ کرے گا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر طنز کرنے والے شخص کو ثابت کرے گا کہ معذوری نابینا ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مائنڈ سیٹ کا نام ہے۔

اسی جذبے سے اُس نے 2013 میں کامیابی سے اپنے کالج کی تعلیم مکمل کی۔ اور تعلیم مکمل کرتے ہی اُس نے ایک بڑا فیصلہ کیا اپنے گھر سے دور ہونے کا فیصلہ، اپنوں سے ملنے

والے سہاروں سے دور ہو کر خود پر اعتماد کر کے اکیلے آگے بڑھنے کا فیصلہ اور اس طرح وہ اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہو گیا۔ جب اس نے سہاروں سے جان چھڑا لی تو خدا کی ذات نے اُسے بڑے مواقع دینا شروع کر دیے۔

پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ اُس کا خواب تھا۔ یہاں آ کر شروع میں اُسے بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر استاد کو جا کر اپنے مسائل بتانے پڑتے۔ ساتھی طلبا کی طرف سے بھی شروع میں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ وہ اُسے اپنے گروپ میں شامل نہیں کریں گے اس طرح پریزنٹیشن میں اُن کے نمبر کم ہو جائیں گے۔ اگر وہ دکھی رہنا چاہتا تو بہت سی باتیں تھیں پر وہ زندہ دلی سے جینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

اُنہوں نے 2014 میں ینگ لیڈرز کی ایک بڑی کانفرنس میں حصہ لیا جس نے اُس کی زندگی بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کانفرنس کے بعد اُس نے ٹرینر بننے کا فیصلہ کیا۔ کیوں کہ وہ سوسائٹی میں ایک مثبت تبدیلی کا خواہاں تھے۔ اور اس خواب کو پورا کرنے کے لیے اس نے سکول آف لیڈرشپ سے باقاعدہ سرٹیفائیڈ ٹرینر کا کورس کیا۔

اب یہ نابینا لڑکا جو لوگوں کے طعنے سن کے کونوں میں جا کر روتا تھا۔ روتے ہوؤں کو جینے کا فن سکھانے لگا۔ وہ جس کا مسئلہ کوئی نہ سنتا تھا نہ سمجھتا تھا اب سب کے مسئلے توجہ سے نہ صرف سننے لگا بلکہ اُنہیں حل بھی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسنے برٹش کونسل سے سوشل ورک کا باقاعدہ کورس مراکش سے جا کر کیا جس میں صرف دو لوگ پاکستان سے سلیکٹ ہوئے تھے۔ وہاں کورس میں شامل مختلف ملکوں سے آئے 30 افراد میں وہ واحد تھا جو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ کامیابیاں اُس کا حوصلہ لحہ بہ لحہ بلند کر رہی تھیں۔

اُسے کھیلوں سے محبت تھی لیکن اس کے ملک میں نابینا افراد کے لیے فقط کرکٹ کا آپشن تھا جو کہ اُسے پسند نہیں تھا۔ وہ کچھ الگ سے کرنا چاہتا تھا۔ اور اسی ایڈونچر کی تلاش میں اس نے "راک کلائمبنگ" کرنا شروع کر دی۔ نابینا ہونے کے باوجود چٹانوں کو سر کرنے والا یہ لڑکا مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔ اس کی اس کامیابی نے اس کی شہرت کو میڈیا تک پہنچا دیا اور پھر ہر کوئی اُسے انٹرویو کے لیے بلانے لگا۔ سب جاننا چاہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ممکن ہوا؟

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو

## طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

''سلیمان ارشد'' نے سوچا کہ اگر وہ کرسکتا ہے تو باقی نابینا کیوں نہیں کرسکتے اور اُس نے 2015 میں پیرا کلامبنگ ایڈونچر کلب کی بنیاد رکھی اور اس طرح وہ نابینا افراد کو ٹرینڈ کرنے لگا۔ 2016 میں اُس کی محنت نے اُسے جاپان پہنچا دیا وہ وہاں یوتھ ڈویلپمنٹ فاونڈیشن میں منتخب ہوا۔ جہاں اُسے خود کو آزمانے اور اپنے آپ کو ثابت کرنے کے بھرپور مواقع ملے۔ وہاں اُسے نارمل افراد کے ساتھ تربیت ملی اور وہ پورے ایشیا سے کامن ویلتھ یوتھ ورکر ایوارڈ سے اکیلا منتخب ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس کی اس عظیم کامیابی پر برطانیہ کی حکومت نے اُسے دعوت دی اور ملکہ برطانیہ اور پرنس کی موجودگی میں اُسے خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔

آپ زندگی کی مشکلات دیکھیں اور پھر محنت کا صلہ دیکھیں۔ اللہ کی ذات کبھی ایسے لوگوں کو اکیلا نہیں چھوڑتی جو اپنے مسائل سے لڑنا جانتے ہیں، جو جانتے ہیں کہ اُس پاک ذات نے سب کو برابر کی صلاحیتیں دے کر بھیجا ہے یہ اور بات ہے کہ ہم دیکھنے سے خود قاصر ہوتے ہیں اور ان صلاحیتوں کو دیکھ ہی نہیں پاتے جو کسی بھی شخص نے کسی بھی کمی یا معذوری کے عوض حاصل کی ہوتی ہیں۔

آج سے عہد کریں ان 24 گھنٹوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ جو اللہ پاک نے آپ کو سارے حواس دیے ہیں ان سے بھرپور کام لینے کا۔ جس دن آپ کو یہ ہنر آ گیا۔ اُس دن آپ خود کو کامیابی کی شاہراہ پر گامزن محسوس کریں گے۔ آج کے ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا جذبہ ہی زندہ دل لوگوں کی پہچان ہوتا ہے۔ یاد رکھیں!

''آپ کے خواب لوگ نہیں بلکہ صرف آپ کی سستی اور کاہلی چھینتی ہے''

✿✿✿

# محسن نواز

# Mohsin Nawaz

اپنی پیاری آواز کے جادو سے لوگوں کو مسحور کر دینے والا "محسن نواز" کیسے اپنی زندگی کی جنگ جیتنے میں کامیاب ہوا

"محسن نواز" پاکستان کا ایک جانا پہچانا نام ہیں۔ ان کی محنت اور کامیابی کے لیے کوششیں بے مثال ہیں۔ بے شمار مشکلات کے باوجود اس عظیم شخص نے ہارنا گوارا نہیں کیا۔ آپ ان کی کہانی پڑھیں گے تو آپ کو کامیابی کے داموں کا خود ہی اندازہ ہو جانے گا اور آپ انہیں دل سے داد دینا چاہیں گے۔ ان سے ملنا چاہیں گے۔

"محسن نواز" صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ وہ تین سال کی عمر میں پولیو کا شکار بنے اور چلنے پھرنے سے مکمل معذور ہو گئے۔ لیکن تعلیم سے ان کی محبت بے مثال تھی وہ نہ صرف بے شمار کتابیں پڑھنا چاہتے تھے بلکہ خود بھی بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ اور یہ لکھنے کی خواہش انہیں بچپن سے ہی بچوں کی کہانیوں کی طرف لے آئی۔ وہ چاہتے تھے ان کی کہانیوں کو

سب لوگ پڑھیں اسی وجہ سے انہوں نے کہانیاں لکھ کر مختلف رسالوں کو ارسال کرنا شروع کر دیں۔

ان کی شدید خواہش تھی کی وہ اپنی کہانی کو کسی رسالے یا اخبار میں دیکھیں۔لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب ان کی پہلی کہانی چھپ کر آئی تو وہ اُسے پڑھنے سے قاصر ہو چکے تھے۔ خدا نے چلنے پھرنے کی معذوری کے بعد ان سے آنکھوں کی روشنی بھی واپس لے لی تھی۔

''محسن نواز'' کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ان کی زندگی کچھ عرصے کے لیے محدود ہو گئی۔وہ بہت سوچتے کہ اب وہ کیا کریں۔پھر ایک دن ایک محلے کی عورت ان کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔اُس مایوس عورت نے جب محسن کی حالت دیکھی تو ان کی والدہ سے کہا کہ آپ اس کے لیے دعا کیوں نہیں کرتیں۔والدہ نے حیرت سے پوچھا کیسی دعا تو وہ کہنے لگی یہی کہ اللہ اسے اپنے پاس بلا لے۔والدہ کو اس کی سوچ پر شدید دکھ ہوا۔وہ تو چلی گئی لیکن یہ سب باتیں ''محسن نواز'' کے کانوں میں اتر کر اس کے اندر ایک انقلاب برپا کر چکی تھیں۔وہ سوچنے لگے کہ کیا ہوا چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہوں۔کیا ہوا اگر میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر ہوں تو کیا میرا باقی وجود قائم نہیں ہے۔میں اسی باقی وجود کے ساتھ بھرپور محنت کروں گا۔مجھے یہ نہیں دیکھنا کہ میرے پاس کیا کیا نہیں ہے بلکہ مجھے اُس پر توجہ دینی ہے جو میرے پاس ہے۔ مجھے اُسے کام میں لا کر ہر ناممکن کو ممکن کر کے دکھانا ہے۔میں دنیا کو بتاؤں گا کہ میں کسی پر بوجھ نہیں ہوں۔

اس کے بعد ''محسن نواز'' کی محنت مزید بڑھ گئی اور ناممکن سے ممکن کا ایک بے مثال سفر شروع ہوا۔انہوں نے ہر حال میں نہ صرف اپنے وجود کو منوانا تھا بلکہ خود مختار ہو کر دکھانا تھا۔ پڑھائی کا طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ وہ کیسٹیں خرید کر دوستوں کو دیتے اور انہیں کچھ اسباق ریکارڈ کرنے کا کہتے جنہیں وہ خود سن کے یاد کرتے۔لہٰذا اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے انہوں نے اپنے کانوں ہی کو اپنی آنکھیں بنا لیا۔اور ان سننے والی آنکھوں سے انہوں نے پندرہ سو کتابیں زبانی یاد کر ڈالیں۔واقعی ایسی محنت کسی خاص جذبے کے تحت ہی ممکن ہے۔اس کے علاوہ مزید سیکھنے کے لیے انہوں نے ریڈیو کو اپنی یونیورسٹی بنا لیا۔وہ اس پر چلنے والا ہر معلوماتی پروگرام سننے کی کوشش کرتے اور اپنے علم میں اضافہ کرتے چلے گئے۔

ان کی والدہ نے اُن کی کامیابی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ جانتی تھی کہ محسن کے لیے باہر جانا مشکل ہے لہٰذا ان کے جو بھی دوست گھر آتے تھے وہ ان سے اتنی شفقت سے پیش آتی ان کی اتنی خاطر مدارت کرتیں کہ وہ ان کے گھر ہی کا حصہ بن جاتے اور مسلسل آتے جاتے رہتے۔

آج وہی آنکھوں اور ٹانگوں سے محروم ''محسن نواز'' جسے لوگ گھر والوں پر بوجھ تصور کرتے تھے، نہ صرف اپنا بلکہ پورے خاندان کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ آج وہ ایک بڑی کمپنی ''ویکنگ ویز'' کے ایچ آر کا ڈائریکٹر ہے اور باقاعدہ ریڈیو پر اپنی آواز کا جادو جگاتا ہے۔ وہی ''محسن نواز'' جس نے خود مایوس ہونا نہیں سیکھا تھا، آج لوگوں کو بھی مایوس ہونے سے بچاتا ہے۔ وہ دنیا کا پہلا ''آر۔ جے'' ہے جو دو معذوریوں کے ساتھ ریڈیو کی دنیا میں آیا اور تیرہ سال سے کامیابی کے ساتھ ریڈیو پروگرام ہوسٹ کر رہا ہے۔ وہ اپنے پروگراموں میں لوگوں کو امید اور کامیابی کا درس دیتا ہے۔ آج وہ اپنی کامیابی کو ساری دنیا کے ساتھ بانٹ رہا ہے۔

''محسن نواز'' کی کامیابی سے آپ کو اپنی زندگی کے لیے کوئی سبق ملا؟ آپ نے دیکھا کہ زندہ دل لوگ کیسے ہر طنز اور تکلیف کو اپنی طاقت بنا لیتے ہیں۔ وہ ہرگز اپنی ناکامیوں کی وجوہات نہیں بتا رہے ہوتے۔ انہیں اپنی کامیابی کی وجوہات سے غرض ہوتی ہے۔ لہٰذا سیکھنے کی بات ہے کہ اگر آپ مثبت سوچ اپنا لیں تو کسی کی منفی سوچ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ معذوری کی کیسی بھی شدت کیوں نہ ہو جب کوشش کی جائے تو کامیابی کبھی آ کر یہ نہیں کہتی کہ بیٹا تم ایک معذور انسان ہو لہٰذا میرے خواب نہ دیکھو۔ آپ کے اردگرد بے شمار مایوس اور ٹوٹے ہوئے لوگ ہوں گے۔ اگر ممکن ہو تو انہیں زندگی کا مطلب سمجھنے میں مدد فرمائیں۔

''یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کے خوابوں نے منزل پانی ہے یا قبر میں جانا ہے''

❁❁❁

# ڈاکٹر انعم نجم
## Dr.Anum Najam

تکلیفوں سے بھرپور ایک طالب کی زندگی جو مفلوج ہو کر بھی
لاکھوں لوگوں کی مسیحا بنی

اس زرخیز زمین کی ایک اور بیٹی "انعم نجم" ہیں۔ وہ ایک ذہین، محنتی اور پرعزم طالبہ تھیں۔ جن میں شروع ہی سے منفرد کام کرنے کا جذبہ اور لگن موجود تھی۔ والدین کے ساتھ دو بھائیوں اور ایک بہن پر مشتمل یہ چھوٹا سا خاندان مظفرآباد میں رہائش پذیر ہے۔ عام اداروں سے تعلیم حاصل کرتے کرتے انعم نے جب ایف ایس سی کی تو اپنے لئے ایم بی بی ایس کا شعبہ چنا اور "ایوب میڈیکل کالج" ایبٹ آباد میں تعلیم شروع کی۔

ان کی زندگی کی آزمائش اُس وقت شروع ہوئی جب وہ میڈیکل کی طالبہ تھیں۔ ایک دفعہ دوران سفر ڈاکوؤں نے اُن کی گاڑی کو لوٹنے کی کوشش کی مگر مزاحمت کرنے پر ڈاکوؤں کی فائرنگ سے ڈاکٹر انعم کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک گولی لگی جو اُن کو زندگی بھر کے لئے

مفلوج بنا گئی۔ علاج معالجہ کی وجہ سے وہ بچ تو گئیں مگر اُن کی ٹانگیں مکمل طور پر اور دونوں ہاتھ جزوی طور پر بے کار ہو گئے۔ اس بچی کے پاس بھی اُس وقت دو راستے تھے۔ یا تو سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جائے اور ساری زندگی اپنی معذوری کو اپنی مجبوری سے منسوب کر کے ایک بے بسی کی زندگی گزار دے۔ اور دوسرا راستہ سینہ تان کر ہر مشکل سے ٹکرانے کا تھا۔ انہوں نے دوسرا راستہ اپنایا اور ہمت نہیں ہاری اور نہ ہی اس غیر متوقع حادثے کے نتیجے میں ہونے والی معذوری کے آگے سر جھکایا۔

اس جواں ہمت بیٹی نے معذوری، مشکل، تکلیف اور اذیت برداشت کرنے کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اعلیٰ تعلیم اور کامیابی کا تعلق جسمانی ساخت سے زیادہ مصمم ارادے اور کچھ کر دکھانے کے جذبے سے ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو کامیابی کے سفر میں رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرتے وہی بالآخر غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازے جاتے ہیں اور کامیابی اُن ہی کے قدم چومتی ہے۔ لہٰذا وہ ایک مضبوط ہمت اور حوصلے کے ساتھ دنیا کی گہما گہمی میں مصروف ہو گئیں۔

شروع شروع میں ''انعم'' کو میڈیکل کی طالبہ ہونے کے ناتے پوری امید تھی کہ چند دنوں میں وہ چلنے پھرنے لگیں گی کیونکہ ان کی ہمہ وقت متحرک اور زندگی سے بھرپور شخصیت بستر پر لیٹنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ انتظار مہینوں اور پھر برسوں پر پھیل گیا۔ انھیں اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے حتیٰ کہ کروٹ بدلنے جیسے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے گھر والوں کی مدد ضرورت پڑتی تھی۔

معذوری ان کے لیے پہلا بڑا جھٹکا تب لائی جب عزیز و اقارب کے بعد ان کے تعلیمی ادارے نے بھی ان کی تعلیم جاری رکھنے کے سلسلے میں مایوسی کا اظہار کر دیا۔ انعم کے بقول یہی وہ لمحہ تھا جب انھیں احساس ہوا کہ اگر تعلیم حاصل نہ کی تو آنے والی زندگی ان کے لیے اس سے بھی زیادہ مشکلات لائے گی۔ انھوں نے والدین سے ضد کی کہ انھیں ہسپتال کے بستر پر ہی کتابیں لا کر دی جائیں کیونکہ وہ تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہیں۔

انعم کہتی ہیں کہ ''اس سارے عرصے میں اگر میں پہلی بار روئی تو اُس دن جب میں

پہلی بار ویل چیئر پر بیٹھی تھی لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے کیونکہ میری زندگی میں حرکت لوٹ آئی تھی۔اب میں ایک جگہ ساکت نہیں رہی تھی"۔

شدید تکلیف کے باوجود انہوں نے دن رات محنت کی اور اپنا کوئی بھی تدریسی سال ضائع کئے بغیر ایم بی بی ایس کی تعلیم کو جاری رکھا۔دوران تعلیم ان کے مہربان و مشفق اساتذہ، نہایت ہمدرد اور غمگسار، دوستوں والدین اور خاندان کے دیگر افرد نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ انہی کی دعاؤں، تسلیوں اور دی جانے والی اخلاقی مدد کی وجہ سے ہی وہ اس قابل ہو سکیں کہ ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد ہاؤس جاب شروع کی اور پھر سپیشلائزیشن کی۔ان کی والدہ نے ان کا بہت ساتھ دیا اور اس کے بعد جب وہ دوبارہ مظفر آباد آئیں اور پریکٹیکل کیریئر شروع ہوا تو عام ساتھی ڈاکٹرز نے بھی ان کا بہت ساتھ دیا۔ان ڈاکٹرز کی نگرانی میں انہوں نے اپنے پروفیشن میں بہت کچھ حاصل کیا۔معذوری کے بعد جو مشکلات آئیں اور جس طرح اُن کا مقابلہ کیا اُن کے بارے میں وہ کہتی ہیں۔

جب انسان صحت مند ہوتا ہے تو اسے اللہ پاک کی عطا کردہ نعمتوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ ان نعمتوں کا استعمال اپنا حق سمجھتا ہے۔ تاہم اگر ان میں سے کوئی ایک نعمت بھی چھن جائے تو زندگی ادھوری رہ جاتی ہے اور مسائل بڑھ جاتے ہیں۔میرے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔اس حادثے کے بعد میری پڑھائی کی روٹین' کالج میں اٹھنا بیٹھنا' دوستوں اور فیملی کے ساتھ گھومنا پھرنا' یہ سب ایک دم سے مختلف ہو گئے۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ میرے جسم کے ساتھ ساتھ میرے ذہن کو بھی ان نئے چیلنجز کا سامنا تھا۔

اس حادثے کے بعد اندازہ ہوا کہ اچھی صحت کے ساتھ بہت دیر تک پڑھائی کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ مگر جسمانی معذوری یا کسی کمی کے بعد انسان کو بہت مشکل سے ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے۔ خیر ان تمام مراحل میں میرا اعتماد اور حوصلہ بحال رہا۔علم کی محبت اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ میری مشکلات پر حاوی ہو گیا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے اٹھنے بیٹھنے' پڑھنے اور ملنے ملانے کی عادات اور آداب کو تبدیل کیا۔ پھر میں اپنی نئی زندگی کے معمولات کی عادی ہو گئی۔ مگر میرا ایک پیغام ہے اپنے ان تمام بہن

بھائیوں کے لئے جو کسی ایسے مسئلے سے دو چار ہوں کہ آپ نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑنا۔ اپنے ذہن اور جسم کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات نے انسان میں بہت لچک رکھی ہے۔ انسان میں بہت صلاحیتیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہم نے صرف ان کو ڈھونڈنا ہے۔ اگر آپ یہ کام کرنے میں کامیاب ہو گئے تو زندگی میں تمام چیلنجز کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

انعم کہتی ہیں:

''میں نے خود کو 'میں ہی کیوں؟' والی مایوسی سے نکالا کیونکہ جو ہوا تھا اسے بدل نہیں سکتی تھی اب مجھے تبدیلی اپنے اندر لانا تھی۔ میرے لیے اہم یہ تھا کہ میں اپنے مقصد تک جا رہی ہوں یا نہیں۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ میں اپنے پیروں پر چل کر جاتی ہوں یا وہیلز پر۔''

معذوری کے باعث پیدا ہونے والے دیگر طبی مسائل کا مقابلہ کرتے ہوئے انعم نے میڈیکل کی تعلیم مکمل کر لی۔ یہاں ان کے لیے ایک نیا فیصلہ منتظر تھا۔ معذوری کی وجہ سے چونکہ وہ ہاتھ ہلانے کے قابل نہیں تھیں اور انہیں انسانی رویوں، جذبات اور احساسات کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی لئے انہوں نے سائیکالوجی کے شعبے کو چنا۔

دوران تدریس ''انعم'' جس حادثے کا شکار ہوئیں اس قسم کے حادثے انسانوں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک معاملات زندگی کو اس حادثے کے بعد روکنا بلا جواز تھا۔ وہیل چیئر پہ آ جانا ان کے لئے اتنا بڑا جواز نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر بدل دیتیں۔

''انعم نجم'' نے ہمیشہ رب کی ذات کا شکر ادا کیا۔ ایک وقت آیا کہ وہ بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو چلی تھیں۔ ایسے حالات میں اللہ کے ذکر نے ان کے دل و دماغ کو تقویت دی۔ ان کا کہنا ہے کہ مایوسی، ناامیدی کی طرف لے جاتی ہے اور ناامیدی کا مطلب ہے کہ آپ نے زندگی سے ہار مان لی ہے۔ انہوں نے قائداعظم کی مثال کو سامنے رکھ کر مشکل حالات کا مقابلہ کیا اور ہمت ہارے بغیر انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ صرف وہی وقت تعلیم سے

دور گزرا جو علاج کی غرض سے ہسپتالوں میں گزرا۔

انہوں نے معذوری کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ ان پر حاوی ہو کر ان کی پہچان بن جائے بلکہ ایک جہدِ مسلسل سے خود کو اس قابل بنایا کہ آج وہ لوگوں کی خدمت کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

آج وہ ڈی ایم ایچ مظفر آباد میں بطور سپیشلسٹ روزانہ سینکڑوں مریضوں کو صحت یاب کرنے کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ وہ ان لوگوں سے جن کے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، سے زیادہ محنت اور زیادہ وقت مریضوں کے ساتھ صرف کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اکثر مریض تو مجھے دیکھ کر ہی بہتر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر آپ ہمت کر سکتی ہیں تو ہمارے مسائل تو آپ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔

''انعم نجم'' ہسپتال کے علاوہ بھی لوگوں خصوصاً لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے پیش پیش رہتی ہیں۔ وہ اکثر تقاریب میں شرکت کر کے اپنے ذاتی تجربات بانٹ کر دوسروں کو ہار نہ ماننے کی تلقین کرتی ہیں۔ وہ آج حوصلوں کی ترجمان کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ وہ بے شمار مایوس لوگوں کے لیے امید کا سرچشمہ ہیں۔

''انعم نجم'' کے پاس ہر طرح کے مریض آتے ہیں اُن میں کچھ معمولی نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہوتے ہیں اور تھوڑی سے علاج معالجے سے ٹھیک ہو جاتے ہیں اور کچھ تھوڑے پیچیدہ مسائل کا شکار ہوتے ہیں جو کہ وقت کے ساتھ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

عزم و ہمت کا یہ نشان ان لوگوں کے لئے مشعل راہ ہے جو کسی بھی طرح کی معذوری کو زندگی بھر کا روگ سمجھ کر غیر فعال زندگی گزار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انعم کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اُنہیں اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

آپ کے اردگرد بھی بے شمار ایسے لوگ ہوں گے جن کو حادثات یا کسی معذوری نے گھیر لیا ہوگا۔ انہیں بتائیں کہ کیسے مشکلوں کے ساتھ بھی نہ صرف کامیاب زندگی ممکن ہے بلکہ آپ بے شمار لوگوں کے لیے مثال بن سکتے ہیں۔ اُن کا حوصلہ بن کر انہیں اُن کی اہمیت کا

احساس دلائیں۔ انہیں سمجھائیں کہ عبرت اور تکلیف وہ زندگی سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ کامیاب ہو کر دکھایا جائے۔ آپ آج ان کی آنکھوں کی امید بنیں وہ کل شاید لاکھوں کی امید بن جائیں۔

"انسان کے ہاتھ پاؤں نہیں بلکہ اُس کے حوصلے اُس کو اونچا اُڑاتے ہیں"

❁❁❁

# رانا تاب عرفانی
Rana Taab Irfani

دوسروں کی خدمت کے لیے ایسا بے لوث شخص، جس نے اپنا سارا سرمایہ لٹا کر، اپنا گردہ تک بیچنے کا اشتہار دے ڈالا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے ایک سال قبل پیدا ہونے والے رانا تاب عرفانی نے جب صرف دو سال کی عمر میں چیچک کی بیماری کے باعث آنکھوں کی روشنی کھوئی تو شاید کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس بچے کی زندگی اور جدوجہد معاشرے کے لیے ایک مثال بن جائے گی۔ فیصل آباد کے علاقے سمن آباد سے تعلق رکھنے والے ''رانا تاب عرفانی'' نے بصارت سے محرومی کو اپنی مجبوری نہیں بنایا اور ساری زندگی علم و ادب کے فروغ اور اپنے جیسے نابینا افراد کی خدمت میں وقف کر دی۔

اُن کا یہ شعر ان کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے:

تحریک بن کے عمر گزاری ہے دار پر
منزل کے راستوں میں ہی خود کو مٹا دیا

بینائی سے محروم ہونے کے باوجود "رانا تاب عرفانی" آٹھ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں چار شعری مجموعے اور چار نثری کُتب شامل ہیں۔ شعری مجموعوں میں نظموں کا مجموعہ "سحر تاب"، غزلوں کا مجموعہ "سیارہ شب"، نظموں اور غزلوں کا مجموعے "کرن کا جل" اور "مجھ کو سنگسار کرو اور سرِ بازار کرو" شامل ہیں۔

جبکہ نثری کُتب میں افسانہ "پاؤں کی خوشبو"، سفرنامہ "ساعت کی آنکھ سے"، خود نوشت "اُپلوں کا دھواں" اور ان کی تصانیف پر ہونے والے تبصروں پر مشتمل کتاب "چراغِ تیرہ شبی" شامل ہیں۔

ان کی شاعری کی پذیرائی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ان کی کتاب "چراغِ تیرہ شبی" میں وزیر آغا، مجیب الرحمن شامی، بانو قدسیہ اور اعزاز احمد آذر سمیت چھتیس مشہور ادیبوں کے تبصرے شامل ہیں۔ وہ نابینا ضرور تھے لیکن اُن کے اندر علم کی پیاس صحرا جیسی تھی۔ ایک نارمل انسان شاید زندگی میں کورس سے ہٹ کر دس کتابیں بھی نہیں پڑھتا لیکن وہ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود بریل کی مدد سے اب تک تین ہزار سے زائد کتابیں پڑھ چکے ہیں۔

وہ بچپن میں جب اپنے گاؤں کی محفلوں میں پرانی لوک داستانیں سنتے تو بے چین ہو جاتے۔ انکا بھی دل کرتا ان داستانوں کو اپنے الفاظ کا پیرہن پہنا سکیں۔ انہیں اپنے انداز میں دنیا کو سنا سکیں۔ کچھ ایسا کرنے کے لیے وہ ہر وقت مضطرب رہتے۔

جب وہ بینائی سے محروم ہوئے تو اُن دنوں میں نابینا افراد کو یا تو گھر تک محدود کر دیا جاتا تھا یا پھر مسجد کی نظر کر دیا جاتا تھا۔ اُن کے گھر والوں نے بھی انہیں بینائی کی محرومی کی وجہ سے صرف دینی تعلیم تک محدود رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ دین کے ساتھ دنیا کی تعلیم بھی چاہتے تھے اس لیے وہ ڈٹ گئے۔۔ لہٰذا انہوں نے دینی تعلیم بھی حاصل کی مگر اپنی عملی زندگی کا آغاز والدین کے خوابوں کے بالکل برعکس فنِ موسیقی سے کیا اور ریڈیو، سٹیج اور ٹیلی ویژن سے کئی سال تک منسلک رہے۔

انہوں نے تعلیم سے اپنے دماغ کو منور کیا اور اندھے دل و دماغ کے ساتھ زندگی

گزارنا گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے گریجویشن تک رسمی تعلیم حاصل کی۔ بریل کی مدد سے ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ وہ پڑھائی بریل کے ذریعے کرتے اور لکھنے کے لیے انہوں نے ایک شاگرد رکھا ہوا ہے۔ وہ بولتے جاتے ہیں اور وہ لکھتا جاتا ہے اس طرح وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔

اُن کی پہلی کتاب ''کرن کا جل'' 1986ء میں شائع ہوئی تو اسی سال انہوں نے اپنے دوست چودھری عبدالغفور کے ساتھ مل کر بصارت سے محروم لوگوں کے لیے ''عالمی فورم برائے بے بصر مصنفین'' کے نام سے ایک لائبریری کا آغاز کیا۔ وہ علم کی اہمیت کو اندر تک جان گے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اس کی رسائی باقی نابینا افراد تک بھی آرام سے ہو جائے۔ ان کے پاس جتنا سرمایہ تھا انہوں نے اس کے اوپر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اس لائبریری کے لیے اپنا پلاٹ، کار اور سیمنٹ و نمک کی ایجنسیاں تک فروخت کر دیں۔ یہ سرمایہ ختم ہوا تو دوست احباب سے تقریباً ساڑھے چھ لاکھ روپے اُدھار لے کر بھی لگا دیا۔ تب بھی انہیں کچھ کمی محسوس ہوئی اور پیسوں کا بندوبست کہیں سے نہ کر پائے تو انہوں نے اپنا گردہ فروخت کرنے کا اشتہار دے دیا۔

''تاب عرفانی'' بے بصر افراد کی فلاح کے لیے کام کرنے والی دس سے زائد قومی و بین الاقوامی فلاحی تنظیموں کے اہم عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ وہ 1990ء سے 2000ء تک ورلڈ بلائنڈ یونین کے ڈائریکٹر سپورٹس اور ایشین بلائنڈ یونین کے سیکرٹری انفارمیشن بھی رہ چکے ہیں۔

ستر سال کی عمر کو پہنچنے کے باوجود اس باحوصلہ شخصیت کی تعلیمی اور بے بصر افراد کے لیے کی جانے والی کاوشوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اب وہ ''ماہنامہ بینائی'' کے نام سے ایک جریدہ نکالتے ہیں جو بصارت سے محروم افراد کی ترجمانی کرتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ''میں اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ معاشرے کے معذور افراد کو باہر سے نہ دیکھو بلکہ اندر سے دیکھو کیونکہ حقیقی بصارت بندے کے اندر ہوتی ہے۔ ان کا یہ شعر ان کی عزم وہمت کی عکاسی کرتا ہے۔

میں وہ پتھر ہوں جسے تیشہ فرہاد کے ساتھ
گر سلیقے سے تراشو تو خدا بن جاؤں

"رانا تاب عرفانی" صاحب جیسے لوگ اس ملک کا سرمایہ ہیں جو اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اس وطن کے لوگوں کی خدمت سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔ ایسے عظیم لوگ جو دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنے گردے بیچنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ ایک ایسا نابینا شخص جو علم سے عشق کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے ساری دنیا کے لیے عام کردوں۔ مجھے یقین ہے آپ کتابیں پڑھتے ہیں کیوں کہ یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں اس بات کا ثبوت ہے۔ آئیں آج سے تاب عرفانی کے مشن کا حصہ بن کر کتابیں بانٹنے، علم بانٹنے اور علم دوست پیدا کرنے کا بھی عہد کریں۔

"علم چھپانے والے کبھی نامور نہیں ہوتے اور علم پھیلانے والے کبھی گمنام نہیں مرتے"

❁❁❁

# فرزانہ کوثر

## Farzana Kousar

### ایک لاعلاج بیماری میں ایک بہادر ماں اور بیٹی کی تعلیم کا شاندار سفر

ایک وقت تھا معذور افراد کو لوگ معاشرے پر بوجھ تصور کرتے تھے۔ اور ان کی پیدائش کو کسی عذاب، آزمائش یا گناہ کے نتیجے سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس لیے زیادہ تر لوگ انہیں گھروں میں محصور رکھتے تھے۔ پھر تعلیم آئی، شعور آیا ان لوگوں کو مواقع ملے اور انہوں نے ہر معذوری کے ساتھ اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ اس تعلیم اور ان لوگوں کی کامیابیوں نے لوگوں کی سوچ بدل کر رکھ دی ہے۔ آج وہ وقت ہے کہ لوگ کہتے ہیں اللہ پاک ان لوگوں کو ہم سے کچھ زیادہ اور خاص نوازتا ہے۔ اب یہ بات تو خدا کی ذات بہتر جانتی ہے کہ یہ نوازش ان کی معذوری پر ہوتی ہے یا پھر انتھک محنت پر۔ لیکن آج کے دور میں یہی خصوصی افراد اپنے نازک احساسات، انتھک محنت اور بہترین ذہانت کے مالک ہونے کی بنا پر تمام دنیا کے لیے قابل

رشک اور قابل تقلید بنتے جا رہے ہیں۔

"فرزانہ کوثر" کی کہانی اتنی ہمت اور حوصلے والی ہے کہ اسے پڑھ کر آپ کی ہمت اور حوصلہ آپ کے سامنے سوالیہ نشان کی طرح ہوگا۔ فولادی ارادوں کی مالک یہ بچی 1983 میں اسلام آباد میں پیدا ہوئی۔ ایک سال کی عمر میں ٹائیفائیڈ کا حملہ ہوا اور یہ بچی کئی دن ہسپتالوں میں گزارنے کے بعد جب واپس آئی اس کی ہڈیوں کی نموزک چکی تھی اور وہ ایک لاعلاج بیماری کا شکار ہو چکی تھی۔ اب وہ ساری زندگی کے لیے اس حالت میں تھی کہ ذرا سی چوٹ اُس کی ہڈی ٹوٹنے کا باعث ہو سکتی تھی۔ بیماری لاعلاج ہونے کی وجہ سے والدین کی علاج کی ہر کوشش بے کار گئی۔

ہڈیوں کی اس خطرناک بیماری کی وجہ سے وہ سکول بھی نہیں جا سکتی تھی۔ ایک عام انسان کا فیصلہ ایسی حالت میں ہار مان کر گھر میں محصور رہ کر زندگی کے دن پورے کرنا اور قسمت کو الزام دینے سے بڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ پست ہمت نہیں تھی۔ وہ ایک بلند ہمت والدہ کی بلند ہمت بیٹی تھی۔

اُس کی والدہ اُسے گود میں اٹھا کر سکول لے جانے لگی۔ وہ روزانہ ہوم ورک کر کے لے جاتی اور نیا کام لے کر واپس آجاتی اس طرح اُس نے والدہ اور اساتذہ کے تعاون سے پرائمری پاس کی۔ میٹرک میں اس نے سائنس کا انتخاب کیا تو اس کی سکول میں سو فیصد حاضری ضروری ہو گئی۔ ایک انتہائی مشکل اور کٹھن سفر کا آغاز شروع ہو گیا۔

اس کی والدہ دن میں تین مرتبہ سکول آتی جاتی اور مجموعی طور پر آٹھ کلومیٹر روزانہ پیدل چلتی۔ میٹرک کی تین ماہ کی پڑھائی کے بعد فرزانہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور گھر تک محدود ہو گئی اس کے باوجود اس نے اعلیٰ نمبروں سے میٹرک کیا۔ اس بہادر بچی نے اپنی کالج کی تعلیم کے ساتھ بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنے اخراجات اُٹھانے شروع کر دیے اور ڈبل میتھس کے ساتھ بی ایس سی مکمل کر لی۔ وہ سکول اور کالج میں ہونے والے تمام مقابلوں میں بھرپور حصہ لیتی اور اس طرح اس نے قرات، ترانے، نعت، تقریر اور کوئز میں بے شمار ٹرافیاں اور انعامات حاصل کیے۔

آج بھی وہ بچی نہ صرف تعلیم حاصل کر رہی ہے بلکہ تعلیم بانٹ کر اپنے آپ کو خود

مختار بنائے ہوئے ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جس نے اُسے اعتماد دیا کہ وہ کسی پر بوجھ نہیں ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش ہے۔ کوثر اُن ساری ماوں کا حوصلہ ہے جو ساری زندگی لوگوں کی باتیں سنتی ہیں کہ وہ ایسے بچوں کو تعلیم دے کر اپنا وقت اور پیسا برباد کر رہی ہیں۔ وہ اُن ساری ماوں کے لیے رول ماڈل ہے جو مایوس ہونے اور ہار ماننے سے انکار کیے ہوئے ہیں۔ میرا اسلام ہے ایسی ساری عظیم ماوں کے لیے جو باقی ماوں سے لاکھوں گنا زیادہ تکلیفیں برداشت کرتی ہیں پر ان کے حوصلے کم نہیں ہوتے۔ ساری دنیا بھی اُن کی ہمت توڑنے کے لیے کھڑی ہو جائے تب بھی وہ ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتی۔ ان میں ایسی عظیم مائیں بھی شامل ہیں جو اپنے بچوں کے لیے اُن قریبی رشتوں سے بھی دور ہو جاتی ہیں جو اُن کے بچوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ آج ایسی ہی عظیم ماوں کی وجہ سے یہ دنیا خصوصی افراد کی کامیابیوں سے بھرتی جا رہی ہے۔ یہ انہی ماوں کا کمال ہے کہ آج یہ بچے سر اُٹھا کر کھڑے ہیں اور دنیا کو اپنی ہمت اور لگن سے حیران کیے ہوئے ہیں۔ کوثر جیسی بیٹیاں اور مائیں ہمت اور جذبوں کی پیغمبر ہیں۔ آپ بھی عہد کریں ہر حالت میں اپنی امید اور حوصلے کو قائم رکھنے کی۔ عہد کریں کہ کبھی مایوسی بانٹنے والے نہیں بنیں گے اور نہ ہی مایوسی تقسیم کریں گے۔ ایسے لوگ جب تک زندہ ہیں دنیا سے امید کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

**"دنیا لاکھ کہتی رہے کہ آپ کسی قابل نہیں آپ کی غیرت کا تقاضہ ہے آپ انہیں کسی قابل ہو کر دکھا دیں"**

❁❁❁

# ڈاکٹر امیر علی ماجد

## Dr Ameer Ali Majid

### فیصل آباد کے ایک درزی کے نابینا بیٹے کی کہانی جو لندن میں مشیر اور جج کے عہدے تک جا پہنچے

ہم اگر صرف ایک دن آنکھیں بند کر کے گزارنے کا فیصلہ کریں یا اپنے روزمرہ کام سرانجام دے کر دیکھیں تو ہمیں سمجھ آئے کہ یہ آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہیں۔ تب شاید ہم صحیح معنوں میں ان مشکلات اور پریشانیوں کا اندازہ لگا سکیں جو نابینا افراد روزانہ سہتے ہیں۔ ان کی ہمت اور کامیابیوں کو دیکھ کر واضح محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں کے نور سے محروم انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اندر کی نگاہوں سے سرفراز فرمایا ہوا ہے۔ پاکستان کے ''ڈاکٹر امیر علی ماجد'' ایسے ہی مثالی انسان ہیں جنھوں نے اپنی انتھک محنت اور قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں سے ایک مقام حاصل کرلیا ہے۔

وہ سیکنڈ ائیر میں زیر تعلیم تھے کہ ان کی بینائی تیزی سے کم ہونا شروع ہوگئی۔ ان

کے والد صاحب ضلع گوجرہ، فیصل آباد میں درزی کا کام کرتے تھے۔ وہ اپنے نورِ نظر کی آنکھوں کے علاج کیلئے پاکستان بھر کے ڈاکٹروں اور ماہرین امراض چشم کے پاس گئے اور بیرون ملک علاج کیلئے بھی گئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

جب انہیں ہر طرف سے مایوس کن جواب ملا کہ وہ کبھی دیکھ نہیں پائیں گے تو انہوں نے اسے دل سے تسلیم کر لیا اور دوبارہ پڑھائی شروع کر دی بینائی کی نعمت سے محرومی کے بعد انہوں نے مزید محنت سے کام لینا شروع کر دیا اور ایف۔ اے، بی۔ اے کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کر لیے۔ وہ 1947ء میں دوبارہ انگلستان گئے اور وہاں سے ایل ایل بی (آنرز) کی ڈگری لیکر وطن واپس آئے۔

لیکن علم کی پیاس ابھی باقی تھی۔ لہٰذا وہ دوبارہ انگلینڈ تشریف لے گئے اور انہوں نے مشہور برطانوی درسگاہ لنکن اِن سے پہلے بار ایٹ لاء اور ایل ایل ایم کیا۔ ڈاکٹر امیر نے تعلیم کی راہ میں بینائی کو رکاوٹ نہیں بننے دیا انہوں نے نہ صرف قانون میں متعدد ڈپلومے حاصل کیے بلکہ کینیڈا سے سول لاء میں پی ایچ ڈی بھی کر لی۔ وہ دنیا کے پہلے نابینا بیرسٹر ہیں جنہوں نے ''ایئر اینڈ سپیس لاء'' کے موضوع پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

آج کل وہ برطانیہ میں نہ صرف وزارت بہبود معذوراں میں مشیر ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ وہاں امیگریشن جج بھی ہیں۔ برطانیہ کی تاریخ میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ان کی کارکردگی بینا جج سے بہت بہتر ہے۔ ڈاکٹر امیر علی ماجد نے مختلف کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ ساری کامیابیاں ایک محنتی انسان ہی حاصل کر سکتا ہے۔

آپ ان کی محرومی اور کامیابی کا موازنہ کریں۔ کہاں ایک فیصل آباد کے درزی کا نابینا لڑکا اور کہاں کینیڈا کی پی۔ ایچ۔ ڈی۔، انگلینڈ میں جا کر اپنے جیسے لوگوں کا مشیر مقرر ہونا اور جج کے فرائض۔ یاد رکھنے کی بات ہے اگر آپ کے جذبے زندہ ہیں، اگر آپ نے کچھ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ آپ مستقل مزاج بن سکتے ہیں تو دنیا کی ہر کامیابی آپ کے قدموں میں ہے۔

انسان جس مٹی میں پیدا ہوا ہوتا ہے۔ جس مٹی میں اُس نے اپنا بچپن گزارا ہوتا ہے وہ اُسے کہیں بھی جا کر نہیں بھولتی۔ وہ اپنی کامیابی کو اپنی دن رات کی محنت کو اپنی مٹی کے لوگوں

پر خرچ کر کے سب سے زیادہ سکون محسوس کرتا ہے۔

''ڈاکٹر امیر علی'' کا تعلق گوجرہ فیصل آباد سے ہے جہاں آنکھوں کے امراض دیگر علاقوں کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آبائی علاقے میں امراض چشم کے علاج کیلئے ایک ہسپتال تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کر لی ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے وہاں چھ ایکڑ اراضی بھی خرید چکے ہیں۔ تعمیری اخراجات کی مد میں بیشتر رقم وہ اپنی جیب سے خرچ کرنے کا عزم رکھتے ہیں جبکہ لندن میں مقیم ان کے دوست بھی اس سلسلے میں ان کی بھرپور معاونت کر رہے ہیں۔

''ڈاکٹر امیر علی'' کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ وہ اپنے آبائی علاقے گوجرہ کے ہر مریض کو شفایابی سے ہمکنار کرائیں جہاں انہوں نے اپنی زندگی کی سولہ رنگین بہاریں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں کامیابی در کامیابی کے عظیم مثالیں موجود ہیں۔ اگر کوئی نعمت آپ کے پاس ہو ہی نہ تو آپ اُس کے بغیر آرام سے گزارہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بہت بڑی نعمت عین جوانی میں چھن جائے تو اکثر لوگ ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی مایوسی پر قابو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر امیر صاحب نے نہ صرف اس محرومی کو قبول کیا بلکہ اسے کسی بھی طرح سے اپنے راہ کی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ اور وہ اعزاز حاصل کیے جن کے خواب آنکھوں والے دیکھتے ہیں۔

**''زندگی میں جس تناسب سے مسائل ہوتے ہیں اُسی تناسب سے انعام بھی ہوتے ہیں''**

❁❁❁

# پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

## Prof Dr Sheikh Muhammad Iqbal

ایک نابینا پروفیسر کی کہانی جن کی زندگی کا مقصد خصوصی افراد کی تعلیم و تربیت رہا۔

تعلیم کی شعبے میں نابینا افراد کی کامیابیاں آپ کو خصوصی افراد میں سب سے زیادہ ملیں گی۔ اب تک کی ریسرچ کے مطابق ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنی کامیابی کو خود تک محدود نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ اپنے جیسے باقی لوگوں کو بھی آگے لانے میں بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ اپنی پوری کمیونٹی کے لیے رول ماڈل بن جاتے ہیں۔ یہ اپنے جیسے لوگوں کے لیے پُل کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ دوسروں کی ٹانگیں نہیں کھینچتے بلکہ اپنی کامیابی کو دوسروں کی کامیابی سے منسوب کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ اکیلے کامیاب نہیں ہوتے بلکہ اپنے ساتھ بے شمار لوگوں کی کامیابی کے ضامن بن جاتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کا نام اور ان کی ادب، صحافت اور سماجی شعبے میں خدمات

کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بصارت کی نعمت سے محرومی کے باوجود انہوں نے جہد مسلسل کے ذریعے نہ صرف خود زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں بلکہ درس تدریس کے ذریعے لاکھوں طلباء، طالبات کی علمی تشنگی کی تسکین بھی کی۔ پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال 15 مارچ 1945 کو پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں بینائی ضائع ہوئی لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے ایم۔اے انگلش کا امتحان پاس کیا اور رول آف آنر حاصل کیا۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں انگریزی کے استاد متعین ہوئے اور طویل عرصہ تک درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد 2 دسمبر 1997ء کو رضا کارانہ طور پر ریٹائرمنٹ لی۔

اکثر افراد کی زندگی ریٹائرمنٹ کے بعد بہت محدود ہو جاتی ہے۔ وہ فقط گھر کے چند کاموں کے لیے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر ریٹائر نابینا بھی ہو تو پھر وہ باقی دن کیسے گزارنا پسند کرے گا۔ خود بصارت سے محروم ہونے کے ناطے ڈاکٹر صاحب نابینا افراد کا درد بھی جانتے تھے اور ان کے مسائل بھی۔ اُن کا نام نابینا طلباء و طالبات کی تعلیم و تربیت اور خدمات کے سلسلے میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ لہٰذا انہوں نے پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائینڈ تنظیم کے تحت نابیناؤں کی تعلیم و تربیت کیلئے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو گزشتہ کئی سال سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ قومی سطح پر پاکستان تھنکرز فورم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد ملک بھر کے اصحاب علم و فکر کو جمع کر کے قومی سطح کے معاشرتی مسائل پر سوچ بچار کرنا اور ان کا حل تجویز کرنا ہے۔ صحافتی شعبے میں بھی آپ کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ آپ، شاعر، نثر نگار اور ادیب بھی ہیں اور اب تک آپ کے قلم سے متعدد کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔

آپ کو اتنی خدمات کے صلے میں حکومت اور تنظیموں نے مختلف انعامات، اعزازات اور ایوارڈز سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال ایک توانا اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی متحرک شخصیت کا اظہار اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ریٹائرمنٹ حاصل کرنے کے باوجود زندگی کی دوڑ سے ریٹائرڈ نہیں ہوئے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ڈگری نہ صرف ان کے لئے ایک اعزاز کا باعث ہے بلکہ ان نابینا افراد کیلئے بھی ایک مثال ہے جو زندگی کی کٹھن راہوں پر اپنی منزل کی تلاش میں کوشاں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں سب سے خوبصورت بات جو مجھے نظر آئی وہ خصوصی افراد سے بے پناہ محبت اور اپنا آپ اُن کے لیے وقف کر دینا ہے۔ ایک ایسی عمر جس میں انسان صرف آرام پسندی کو ترجیح دیتا ہے وہ اس عمر میں مزید محرک نظر آتے ہیں۔ وہ ماہنامہ ''سفید چھڑی'' کے مدیر بانی ہیں۔ وہ کچھ عرصہ پنجاب یونیورسٹی کے سپیشل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ علامہ اقبال کی فکر کو اُجاگر کرنے اور قوم کی نئی نسل کو انکی عظمت رفتہ سے روشناس کرانے میں انتھک محنت کر رہے ہیں۔

انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی کو کامیاب بنایا بلکہ پورے ملک کے نابینا افراد کے لیے میدان میں اُتر آئے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو دلوں میں جیتے ہیں اور اس دنیا سے کبھی رخصت نہیں ہوتے۔

آپ زندگی کے جس بھی مقام پر ہیں بانٹنے والے بن جایئے۔ دوسروں کے لیے جینا شروع کر دیجئے آپ کی زندگی اتنی خوبصورت ہو جائے گی کہ آپ خود پر رشک کرنے والے بن جائیں گے۔ لیکن ایسا ہرگز فقط سوچنے سے ممکن نہیں۔ ساری دنیا ایسا ہی چاہتی ہے۔ عمل کے میدان میں اترنا ہوگا۔ عمل والے لوگ بہت مختصر ہیں۔ لیکن وہ اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ آپ بھی اپنی پہچان بنایئے۔ ایک بانٹنے والے کی پہچان۔ آپ فقط مسکراہٹیں بانٹ کر دنیا کے ساتھ اپنے اللہ کو بھی راضی کر سکتے ہیں۔ چلیں اور کچھ بھی نہیں ہے تو اسی سے آغاز کیجئے آپ کی مسکراہٹ، امید، حوصلہ بے شمار لوگوں کی زندگی بدل سکتا ہے حالانکہ اس کے لیے آپ کو فقط ایک اچھا دل ہی تو درکار ہے۔

''کسی بھی قیمت پر اپنا شمار ہارے ہوئے اور ناکام لوگوں میں نہ ہونے دیں''

❁❁❁

# ڈاکٹر سلمیٰ مقبول

## Dr Salma Maqbool

پاکستان میں نابینا افراد کے لیے انقلاب لانے والی عظیم ماں

پاکستان میں خصوصی افراد کی تعلیم کے حوالے سے ایک بڑا نام ڈاکٹر سلمیٰ مقبول کا ہے۔ ڈاکٹر سلمیٰ مقبول ان نابینا افراد میں سے تھیں جو پیدائشی طور پر نابینا نہیں ہوتے۔ وہ شروع میں نارمل بچوں کی طرح تعلیمی مدارج طے کرتی رہیں اور ایم بی بی ایس کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے فوج میں ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ بعد ان کی نظر تیزی سے گرنا شروع ہو گئی۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ ''ریٹینٹس پگمینٹوسا'' نامی بیماری میں مبتلا تھیں اور دنیا بھر میں کہیں اس بیماری کا علاج ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا اندھیروں سے بھرپور ایک زندگی ان کے آگے پہاڑ کی طرح کھڑی تھی۔

انہوں نے اس معذوری کے باوجود زندگی کو بھرپور طریقے سے جینے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے کسی پر بوجھ بننے کے بجائے دوسروں کا بوجھ اُٹھانے والی بننے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے سب سے پہلے انہوں نے خود کو خود مختار بنایا۔

وہ اپنے سارے کام خود کرنے لگیں۔ اپنے کپڑے استری کرنا، اپنا کمرہ درست کرنا، بستر ٹھیک کرنا چائے بنانا، وہ بغیر کسی مدد کے سارے کام سرانجام دینے لگ گئیں تو انہوں نے مزید آگے بڑھ کر اپنی زندگی کو خصوصی افراد کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس مشن کے لیے انہوں نے غریب آبادیوں کا انتخاب کیا۔

انہوں نے ''درخشاں'' کے نام سے اپنا ادارہ قائم کیا۔ اور خصوصی افراد کی تعلیم کا ایک کامیاب منصوبہ شروع کیا جس میں تعلیم کے ساتھ تربیت بھی شامل تھی۔ وہ یہاں تک ہی نہیں رکیں بلکہ انہوں نے مزید چار پراجیکٹ پر ایک ساتھ کام شروع کر دیا۔ جن میں ریسرچ سنٹر، نابینا کے لیے تعلیم مہیا کرنے والا ریکارڈنگ انسٹی ٹیوٹ، اور نابینا افراد کی جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے تعلیم تک رسائی بھی شامل ہو گئے۔ ڈاکٹر سلمیٰ مقبول صاحبہ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ دنیا بھر کی تمام نابینا لڑکیاں میری بیٹیاں ہیں۔ ان کی کوششوں سے نابینا افراد پی آئی اے میں 50 فیصد رعایت کے ساتھ اور ریلوے میں فری سفر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سلمیٰ مقبول صاحبہ پاکستان فاؤنڈیشن فائٹنگ بلائینڈنس کی چیئر پرسن تھیں۔ اور خصوصی افراد سے متعلقہ بے شمار آرگنائزیشنز کی ممبرز تھیں۔ انہوں نے خصوصی افراد کے لیے اپنی آواز، جذبے اور خدمت کو فقط پاکستان تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ وہ ان کے لیے پوری دنیا میں سفر کرتی رہیں۔ انہوں نے واشنگٹن ڈی سی میں انٹرنیشنل ٹریننگ فورم میں شرکت کی۔ پاکستان میں نابینا خواتین کیلئے پہلا لیڈرشپ ٹریننگ سیمینار منعقد کروایا۔ انہوں نے کوریا، برازیل، بھارت، جرمنی اور ملائیشیا میں نابینا خواتین کے بارے میں ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ وہ انٹرنیشنل فیڈریشن آف بلائینڈ میگزین کے وومن سیکشن کی ایڈیٹر تھیں۔ ماضی میں انہوں نے بیجنگ میں منعقدہ وومن ورلڈ کانفرنس، نیویارک، تھائی لینڈ اور جرمنی میں بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور معذور خواتین کی نمائندگی کی۔ ڈائریکٹوریٹ جنرل آف اسپیشل ایجوکیشن کے ساتھ ذاتی حیثیت میں وابستہ رہیں۔ معذور افراد کے حوالے سے یہ پالیسی بنانے میں قدم بقدم ڈائریکٹوریٹ کی رہنمائی کرتی رہیں۔ خصوصی

افراد میں میڈیا کے حوالے سے شعور کی آگاہی بیدار کرنے میں میڈیا کمیٹی میں بھی شامل رہیں۔

ڈاکٹر سلمیٰ مقبول صاحبہ نے بے شمار اعزازات حاصل کیے۔ 1992ء میں اقوام متحدہ کے ورلڈ پروگرام کی جانب سے خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔ 1992ء میں ہی معذور افراد کیلئے ایشیاء میں خدمات انجام دینے کیلئے خصوصی ٹرافی دی گئی، 2001ء میں تمغہ امتیاز حاصل کیا، 2003ء میں آل انڈیا کنفیڈریشن آف دی بلائینڈ کی جانب سے اعزازات سے نوازا گیا،، 2005ء میں نوبل انعام کیلئے نامزد ہوئی، 2006ء میں فاطمہ جناح گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آپ جتنا ان کی خدمات اور کامیابیوں کو دیکھتے جائیں گے آپ کو احساس ہوگا کہ معذوری کے باوجود وہ اس ملک کا کتنا بڑا اثاثہ تھیں۔

اب ڈاکٹر سلمیٰ مقبول ہمارے درمیان تو نہیں بلکہ منوں مٹی تلے چلی گیں ہیں مگر ان کی خدمات کو ہم سب سلام پیش کرتے ہیں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا کام کر جاؤ جو حیات جاوداں بن جائے اور تمہارا نام لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرتا رہے۔

عظیم ہیں ایسے لوگ جو اپنی مشکلیں لوگوں کو دکھا کر ہمدردیاں سمیٹنا گوارا نہیں کرتے بلکہ اپنا آپ بھلا کر عمل کے میدان میں ایسے اترتے ہیں کہ زمانہ اُن کی مثالیں دیتا ہے۔ وطن کی یہ عظیم بیٹی اپنے حصے کا بیج بو گئی ہیں۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ نئے بیج بونے ہیں یا پھر آبیاری کرنی ہے۔ ہم سب اس مٹی کی خوشبو کے قرض دار ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہمدردیاں سمیٹنی نہیں ہیں بلکہ بانٹنی ہیں۔ اور اس کام کے لیے ہمیں ہرگز کل کا انتظار نہیں کرنا ہے۔

**”کامیاب کہانی بننے کے لیے بہت سی ناکامیوں کا مسکرا کر سامنا کرنا پڑتا ہے“**

✿✿✿

# نسیمہ ہرزق

## Nasima Herzik

ایک ایسی عظیم خاتون جن سے موت نے منہ موڑا تو اُنہوں نے لوگوں کو جینا سکھادیا

جس طرح ہمت اور حوصلہ انسان سے بڑے بڑے کام کروالیتا ہے بالکل اسی طرح کم ہمتی، پست خیالی اور شدید مایوسی انسان کو جینے کا مقصد بھلادیتے ہیں۔ اور زندگی اُسے اس قدر بوجھ لگتی ہے جس سے وہ جلد از جلد جان چھڑالینا چاہتا ہے۔ ''نسیمہ'' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

''نسیمہ ہرزق'' نے زندگی سے جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ موت کے دروازے سے واپس لوٹ آئی تھیں، ان دنوں جب انہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے خاندان پر بوجھ بنی ہوئی ہیں، موت ہی ایک آخری راستہ نظر آتا تھا۔ آپ ذرا اس کہانی سے اندازہ لگائیں کہ انسان کا یہ عمل کیا فقط اسی کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے؟ اگر ''نسیمہ'' مرجاتی تو کیا

یہ سب کچھ پا سکتی تھی؟ یقیناً ہرگز نہیں۔

آج وہی خاتون دوسروں کے لئے کچھ کرگزرنے کے جذبے سے بھرپور نہ صرف اپنی طرح کے ہزاروں افراد بلکہ پوری دنیا کے لئے ہمت، بہادری، ایثار وقربانی کی بہترین مثال بنی ہوئی ہیں۔ محترمہ نسیمہ ہرزق جو خود کبھی معذوری کی وجہ سے چوبیس گھنٹے بستر پر پڑے رہ کر موت کی دعائیں مانگنے پر مجبور تھیں، لیکن جب سوچ بدلی اور منفی خیالات کی دنیا سے انہوں نے خود کو باہر نکالا تو وہ خاتون آج دنیا بھر کے معذروں کے لئے تحریک وترغیب کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔

بے شک اللہ کی ذات جب اپنا خصوصی کرم فرماتی ہے تو زندگی بدلنے کے لیے ایک خیال کسی کی ایک بات یا پھر ذرا سی حوصلہ افزائی ہی کافی ہوتی ہے۔ نسیمہ ہرزق نے اپنے کام سے کچھ ایسا مقام حاصل کیا ہے آج دنیا انہیں ان کے کام کی وجہ سے جانتی ہے۔ ان کا ادارہ آج ہزاروں معذور بچوں کا آسرا بنا ہوا ہے۔

2 ستمبر 1950 کو پیدا ہونے والی یہ لڑکی جو سکول اور کالج میں پڑھنے کے دوران مختلف تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی کب جانتی تھی کہ وہ ایک دن پوری طرح سے مفلوج ومعذور ہو جائے گی اور انہیں زندگی بھر ویل چیئر کا سہارا لینا پڑے گا۔ اب ہر دن اُن کے لیے ایک عذاب ہوتا۔ بے بسی ان کی برداشت سے باہر تھی۔ 24 گھنٹے بستر پر پڑے پڑے انہیں پورے خاندان پر بوجھ بننے کا احساس ہوتا۔ کتابیں، ریڈیو، کسی میں دل نہیں لگتا تھا وہ اس زندگی کو ختم کرنا چاہتی تھیں، خودکشی کرنے کی بھی طاقت ان میں نہیں تھی۔ گھر والے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ اپنی بہنوں سے کہتیں کہا اگر مجھ سے سچا پیار ہے تو زندگی کو ختم کرنے میں میری مدد کریں۔ لیکن بہنوں نے ان کا خیال رکھنے میں کبھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

وہ سخت مایوس تھی اور پھر ایک امید کی طرح ایک شخص ان کی زندگی میں آتا ہے جو انہیں سکھاتا ہے کہ ویل چیئر کے ساتھ بھی کامیاب زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ وہ اُن میں تعلیم کی امنگ جگاتا ہے اور پھر وہ مایوس لڑکی ایک نئی زندگی جینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اور پھر

جب وہ حقیقت کی آنکھ سے دنیا کو دیکھنا شروع کرتی ہے تو بے شمار لوگ اُسے اپنے سے کئی گنا بری حالت میں نظر آتے ہیں۔ اور وہ ان کے لئے کچھ کرنے ان کی زندگیاں بدلنے کا عہد کرتی ہے۔

اس طرح ایک انسان کی مثبت سوچ حوصلہ افزائی جس نے نسیمہ کی زندگی میں انقلاب پیدا کیا وہ مثبت سوچ اتنی طاقت ور تھی کہ اُس نے ہزاروں افراد کی زندگی بدل کی رکھ دی۔ وہ ایک ایسے ادارے کو فعال کرتی ہیں جس میں معذوری کو ہرانے کے سارے انتظام موجود ہیں۔ یہاں معذوروں کو ہر چیز سکھائی جاتی ہے۔ کھانا پکانا، صفائی کرنا، ہاتھ نہیں ہیں تو پاؤں سے دانت برش کرنا، لکھنا کام کرنا وغیرہ۔

اگر وہ بھی یہ سوچتی کہ یہ حکومت کا کام ہے تو اتنے بڑے ادارے کا قیام کبھی وجود میں نہ آتا۔ اور نہ ہی پھر وہ اپنی کتاب ''کرسی پہیوں والی'' کبھی لکھ پاتی جو کہ اب تک اردو، ہندی مراٹھی، کنڑ اور دیگر زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے دنیا کو ایک ایسی کہانی دی ہے، جس سے ہمیشہ تحریک ملتی رہے گی۔ آج ان کے کام کی وجہ سے دنیا بھر کے بے شمار ایوارڈز ان کی جھولی میں ہیں، لیکن سب سے بڑا ایورڈ ان کے اپنے وہ بچے ہیں، جنہیں معذوری کی وجہ سے اپنوں میں جگہ نہیں ملتی اور وہ دنیا کو جیتنے کے لئے نسیمہ آپا کے پاس آکر دوڑنے لگتے ہیں۔

اس کہانی میں بے شمار سبق ہیں اگر آپ لینا چاہیں تو آپ جان پائیں گے کہ کس طرح مایوسی آپ کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے اور انسان اپنی قیمتی جان کو بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ اور یہ مایوسی جب کسی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے مثبت کردار ادا کرنے پہ آتی ہے تو اپنے ساتھ لاکھوں زندگیاں بدل جاتی ہیں۔

اگر جینے کا ہنر سیکھنا ہے تو ہمیشہ حوصلہ بانٹنے والے بنیں۔ آپ کی وجہ سے جانے کتنے لوگوں کی زندگی بدل جائے انہیں زندگی کا مطلب مل جائے۔ آج عہد کریں آپ اپنی زندگی میں مایوسی جیسی چیز کو ہرگز جگہ نہیں دیں گے اور جہاں آپ کو یہ کسی اور میں بھی نظر آئی تو آپ اس کے لیے روشنی کی کرن کا کردار ادا کریں گے۔ نہ صرف خود جینا سیکھیں گے بلکہ

اپنے جیسے لاکھوں کو جینا سکھائیں گے۔

"آپ کا جذبہ اگر سچا ہے تو آپ کو قدم بقدم رہنما ملتے رہیں گے"

❁❁❁

# صابریا تنبرکن

## Sabriye Tenberken

محنت، حوصلے اور عظیم جذبوں کی ایسی کہانی جو آپ کو حیران کر دے گی

دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ساری زندگی اپنی کسی محرومی کا رونا روتے ہوئے گزار دیتے ہیں اور محرومیاں بھی ایسی کہ اچھے ساتھی نہیں ملے۔ اچھی تعلیم نہیں ملی۔ زیادہ دولت نہیں ملی یا پھر وہ نعمت نہیں ملی۔ ایسے لوگوں کی زندگی کھانے پینے اور شکوے شکایت کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ وہ ایسے اندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں خدا کی کروڑوں نعمتیں نظر ہی نہیں آ پاتی۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بڑی سے بڑی محرومی کو معمولی خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنی محرمیوں کے باوجود صرف زبان ہی سے خدا کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ اپنے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کو شکر بنا لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ اور یہ کبھی نہیں مرتے۔ زندگی کا مطلب سمجھنا ہو تو ضرور ایسے لوگوں سے ملیں یا کم از کم ایسے لوگوں کی زندگی کا

مطالعہ کریں۔

وہ 1970 میں جرمنی میں پیدا ہوئی۔ وہ "بریل ود آؤٹ بارڈرز" تنظیم کی بانی اور ایک بہترین سماجی کارکن ہے۔ بچپن ہی میں وہ اپنی بینائی سے محروم ہونا شروع ہو گئی۔ اُس کے والدین نے اُس کے علاج کے لیے بھرپور کوششیں کی اور اُسے بے شمار جگہوں پر علاج کے لیے لے کر گئے۔ لیکن پھر بھی وہ 12 سال کی عمر میں مکمل نابینا ہو گئی۔ اور اُسے نابینا افراد کے خصوصی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ اُس کے لیے ایک نئی دنیا تھی۔ اُس نے بریل سیکھی اور سفید چھڑی کی مدد سے چلنا سیکھا۔ وہ سکول لائف ہی میں گھڑ سواری بھی سیکھ گئی۔ سکول سے فارغ ہو کر اُس نے خصوصی طور پر تبت زبان سیکھی اور اُس یونیورسٹی میں وہ پہلی نابینا لڑکی تھی۔

اُس نے فلاسفی اور سوشیالوجی کے مضامین میں جرمن یونیورسٹی سے ایجوکیشن حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے یہ مضامین کسی نابینا فرد نے نہیں لیے تھے لہٰذا ان مضامین میں بریل کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اُس نے 1992 میں اپنی مدد آپ کے تحت یہ مضامین بریل میں کنورٹ کیے جو کہ بعد میں سرکاری طور پر تمام نابینا افراد کے لیے منظور کر لیے گئے۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر وہ لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ اُن کے بچپن کا کچھ عرصہ تبت چین میں گزرا تھا۔ وہ تبت کے بارے میں ریسرچ کرتی ہیں تو اُن کے علم میں آتا ہے کہ تبت میں نابینا افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے لہٰذا وہ تبت جانے کا فیصلہ کرتیں ہیں۔ ان کے اس فیصلے میں کوئی بھی ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ 1997 میں اکیلے چین جانے کا فیصلہ کرتی ہیں تاکہ وہ جان سکیں کہ وہاں نابینا افراد کے لیے کیا کیا سہولتیں میسر ہیں۔ سب جاننے والوں کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہیں، وہ اکیلی نابینا دوسرے ملک میں جا کر کس طرح سے کچھ کر پائے گی۔ اُسے نا تو پڑھانے کا کوئی تجربہ تھا نہ ہی اُسے ٹھیک سے ان کی زبان آتی تھی۔ وہ تبت کے علاقہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ وہ چین میں بیجنگ میں اتریں اور وہاں موجود معذور افراد کی سب سے بڑی تنظیم کے لوگوں سے ملاقات کی۔ لیکن وہ تبت جیسے علاقے میں کام کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔

وہ اکیلی تبت چلی گئیں اور اپنے طور پر معلومات لینے لگیں۔ اُنہیں معلوم ہوا کہ

وٹامن اے کی کمی کی وجہ سے یہاں بہت زیادہ نابینا افراد ہیں۔ ایک ادارے کی ریسرچ کے مطابق 5.2 ملین افراد میں سے 30000 سے زائد لوگ تبت میں نابینا تھے۔

اُنہوں نے ہر گاؤں میں جا کر لوگوں کے لیے آگاہی مہم کا آغاز کیا۔ بے شمار گاؤں ایسے تھے جہاں گاڑیوں کا راستہ نہیں تھا لہٰذا اُنہوں نے اپنے سفر کے لیے گھوڑے کا انتخاب کیا۔ اور یہ سفر تقریباً کئی ماہ تک جاری رہا۔

1998 میں وہ واپس جرمنی گئیں اور چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کردی۔ انہوں نے تبت کے دارالحکومت کو نابینا افراد کی تعلیم کے لیے منتخب کیا تھا۔ کیوں کہ نابینا افراد کے لیے تبت میں کوئی بھی سکول موجود نہیں تھا لہٰذا اُنہوں نے پانچ بچوں کے ساتھ خود سکول کا آغاز کیا۔ وہ خود ہی سکول کی ایڈمنسٹریٹر، وکیل اور استاد تھیں۔ اُنہوں نے باقی اساتذہ کی تربیت کا آغاز بھی خود ہی کیا۔

آغاز میں انہیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ نابینا بچوں کو تلاش کرنا از خود ایک مشکل کام تھا۔ والدین انہیں چھپا کر رکھتے تھے اور سکول بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کوئی بھی آرگنائزیشن امداد کے لیے تیار نہیں تھی انکا خیال تھا ایک نابینا لڑکی کیسے اس طرح کا پروجیکٹ کامیابی سے چلا سکتی ہے۔ 1998 میں انہیں ایک اور ایسا ساتھی ''پال'' کی شکل میں مل گیا جو ایسے ہی کسی مشن پر کام کرنا چاہتا تھا۔ پال نے صابریا کو اس سکول پراجیکٹ کے لیے جوائن کر لیا۔ جسکا نام 2002 میں تبدیل کر کے ''بریل وِد آؤٹ بارڈرز'' رکھ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی صابریا نے نابینا افراد کے لیے ووکیشنل ٹریننگ سنٹر کا آغاز کر دیا تا کہ نابینا افراد ہنر مند ہو کر اپنے پاؤں پر بھی کھڑے ہو سکیں۔

26 سال کی عمر میں اُنہوں نے تمام چھوٹے چھوٹے علاقوں میں جانا شروع کر دیا۔ وہ نابینا افراد کے والدین کو بریل کے بارے میں بتاتی اور انہیں اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے اُس کے ساتھ بھیجنے کے لیے کہتیں اس میں بھی اُنہیں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

دونوں نے 2009 سے دور دراز کے علاقوں میں سکولز، سینٹرز اور ادارے بنانے شروع کر دیے۔ انہوں نے ''کیرلا'' میں انٹرنیشنل سکول فار ڈویلپمنٹ اینڈ پراجیکٹ پلاننگ بھی شروع کیا جس کا مقصد خصوصی افراد کے ٹیلنٹ کو تلاش کرنا اور نکھارنا ہے۔ وہ بچوں کو بریل

تعلیم کے علاوہ پہاڑوں کو سر کرنا اور اپنے حوصلے بلند کرنا بھی سکھاتی ہیں۔ وہ تبت کے علاقوں میں گھوڑے پر سواری کرتیں۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتیں اور چیزوں کی وضاحت ان کے رنگوں سے کرتیں۔ دیکھنے والے ان کی ذہانت اور حوصلے پر حیران رہ جاتے۔

آج ان کے طلبا پوری دنیا میں اپنا آپ نکھار کے اپنی قابلیت ثابت کر رہے ہیں اور اس نابینا لڑکی نے تبت کے لوگوں کی سوچ بدل کر رکھ دی ہے کہ نابینا ہونا خدا کی طرف سے کوئی سزا ہے اور نابینا لوگ بس اسی سزا کو پورا کرنے دنیا میں آتے ہیں۔ نابینا افراد کے لیے اپنا دن رات وقف کر دینے پر اُس نے بے شمار عزت افزائی حاصل کی۔

مارچ 2000 میں جرمنی میں اُسے بہترین خاتون کا ایوارڈ دیا گیا۔ اگست 2000 میں اُسے ترقی پذیر ممالک میں خدمات کے صلے میں ڈچ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ دسمبر 2000 میں اُنہیں ڈاکیومنٹری فلم پر میڈیا کی جانب سے چیریٹی بمبی ایوارڈ حاصل ہوا۔ ستمبر 2002 میں اُنہوں نے اپنی خدمات کے عوض سوئٹزرلینڈ سے ایوارڈ وصول کیا۔ دسمبر 2004 میں یورپین میگزین اور ایشین میگزین سے ہیرو 2004 کے ایوارڈ حاصل کیے۔ 2005 میں وہ نوبل امن انعام کے لیے نامزد ہوئیں۔ 2005 میں ہی میں انہیں ورلڈ اکنامک فورم میں گلوبل لیڈر فار ٹومارو کے لیے منتخب کیا گیا۔ اور اسی سال انہیں جرمن وزیر اعظم کی جانب سے ایوارڈ دیا گیا۔ 2005 ہی میں انہیں ڈونیشن میتھڈز پر ایوارڈ دیا گیا۔

2006 میں ان کی آرگنائزیشن کو مدر ٹریسا ایوارڈ دیا گیا۔ اور اسی سال چین کی گورنمنٹ کی جانب سے انہیں نیشنل فرینڈشپ ایوارڈ دیا گیا۔ 2008 میں صابریا کو 30 سالوں میں چین میں سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی پندرہ شخصیات میں شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایوارڈ کی اتنی بڑی لسٹ کہ آپ حیران ہو جائیں کہ ایک 13 سال کی عمر میں نابینا ہو جانے والی لڑکی کس طرح اتنی عظیم کامیابیاں سمیٹ سکتی ہے۔ بہر حال ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا کے مصداق اس نابینا لڑکی نے اپنے وطن سے کوسوں دور بینائی کی نعمت سے محروم ہزاروں خواتین و حضرات کے لیے اپنی ذات کو وقف کر دیا جس کا صلہ قدرت نے اُسے اس انداز سے دیا کہ اُن کا نام امر ہو گیا اور اُنہوں نے وہ عزت پائی کہ دنیا کے کروڑوں انسان

آنکھوں کی دولت ہونے کے باوجود ایسی عزت اور پزیرائی کے فقط خواب ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اگر ''صابریا'' نے ایک نابینا لڑکی ہونے کے باوجود اتنی بڑی کامیابیاں سمیٹ لی ہیں تو آپ اپنی کامیابیوں کے لیے کھڑی رکاوٹوں پر ایک دفعہ مزید نظر ثانی کریں۔ وہ نابینا ہو کر اکیلی دوسرے ملک جا سکتی ہے۔ وہ پہاڑوں میں کئی ماہ گھوڑے کا سفر نابینا بچوں کے لیے کر سکتی ہے۔ وہ ایسے سکول بنا سکتی ہے جن سے فارغ ہونے والے بچے فارغ نہیں رہتے۔ وہ کئی ملکوں کی حکومتوں سے ایوارڈز وصول کر سکتی ہے۔ وہ چائنا جیسے سب سے زیادہ آبادی والی ملک کی متاثر کن شخصیت بن سکتی ہے تو آپ سوچیں ایسے رول ماڈل سامنے ہونے کے باوجود آپ کہاں تک جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

آپ کہیں زندگی کو چھوٹے چھوٹے خوابوں میں تو نہیں گنوا رہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ آپ کے اس دنیا سے جانے پر کتنا فرق پڑے گا؟ جن لوگوں کے ساتھ آپ کام کرتے ہیں وہ کتنے دن آپ کو یاد رکھیں گے؟ آپ کے خاندان کے قریبی لوگ آپ کے چلے جانے کے کتنے دنوں بعد آپ کا ذکر بھول جائیں گے؟ کیا آپ بھی دیگر کروڑوں لوگوں کی طرح کچھ عرصے میں اس دنیا کے لیے ایک بھولی بسری یاد تو نہیں بن جائیں گے؟

اگر کبھی وقت ملے تو تجزیہ ضرور کریں۔ شاید یہی تجزیہ آپ کو کچھ ایسا کر جانے پر مجبور کر دے کہ آپ کے اپنے تو اپنے بیگانے بھی آپ کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کریں۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔ اور فیصلے میں ہمیشہ مسائل کو نہیں بلکہ وسائل کو پیش نظر رکھنا ہے۔

**''ساری دنیا کے لیے ''ناممکن'' ضروری نہیں آپ کے لیے بھی ''ناممکن'' ثابت ہو''**

❁❁❁

# ٹیری فاکس
## Terry Fox

دوسروں کے لیے اپنی زندگی قربان کر جانے والا لڑکا ''ٹیری فاکس'' جو آج بھی دلوں میں زندہ ہے

آج اگر زندگی کی نفسانفسی کو کچھ دن توجہ سے محسوس کریں تو واضح احساس ہوگا کہ ہماری نئی نسل کی تربیت میں کچھ کمی ہے۔ نوجوان نسل کی خود پسندی ہر دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے لیے کسی کی کامیابی کو دل سے تسلیم کرنا اُسے ہضم کرنا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک عجیب خود غرضی کی دوڑ ہے جس میں اپنی کامیابی سے زیادہ خوشی دوسرے کی ناکامی میں نظر آتی ہے۔ ہمارے سارے اچھے کام لوگوں کی ساتھ کی ہوئی نیکی، بھلائی، زکوۃ خیرات سب شاید سوشل میڈیا کے لیے رہ گئے ہیں۔ ان کو دوسروں سے زیادہ اپنی فکر ہے۔ لوگ وقت کے ساتھ دوسروں کو توجہ دینے، اُن کے کام آنے۔ خلوص نیت سے کسی کا بھلا کر دینے۔ لوگوں میں مسکراہٹیں بانٹنے، محبتیں اور آسانیاں تقسیم کرنے سے دن بدن دور ہوتے جا

رہے ہیں۔ آج ہم سب کو اُن تعلیمات اور اُن روایات کی طرف لوٹ آنے کی اشد ضرورت ہے جو کبھی ہماری ثقافت کی پہچان تھیں۔ نہیں تو وہ وقت دور نہیں جب خونی رشتے بھی بوجھ بن جائیں گے۔ جب والدین کو اپنے بڑھاپے کی فکر اس لیے ہو گی کہ اُن کا بوجھ کون اُٹھائے گا۔ ابھی وقت ہے احساس کو جگائیے۔ اس نسل کو دوسروں کے لیے جینا سکھائیے۔ یہاں دوسروں کے لیے جینے والے ٹیری کی مثال دی جا رہی ہے۔ تا کہ احساس ہو کہ دوسروں کے لیے جینا کیسے انسان کو امر کر دیتا ہے۔ کیسے ''ٹیری'' اور ہمارے عبدالستار ایدھی جیسے لوگ ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

یہ کہانی ایسے انمول جذبے پر مشتمل ہے جو وقت کے ساتھ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ کہانی ہے اُس ''ٹیری فاکس'' کی جو 28 جولائی 1958 کو کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے سکول کے بہترین باسکٹ بال کھلاڑی اور رنر تھے۔ انہیں بچپن ہی سے ہارنے سے نفرت تھی۔ وہ تب تک مسلسل کوشش میں لگے رہتے جب تک کسی بھی کام میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ مارچ 1977 میں 19 سال کی عمر میں اُن کی ایک ٹانگ میں کینسر کی تشخیص ہوئی، جس کی وجہ سے اُسے کاٹ کر مصنوعی ٹانگ لگا دی گئی۔ ڈاکٹروں نے اُنہیں بتا دیا کہ اس کے بعد بھی اُن کی زندگی کی امید ففٹی پرسنٹ ہے۔

مصنوعی ٹانگ لگنے کے تین ہفتے بعد اُنہوں نے گالف کھیلنی شروع کر دی۔ اُنہوں نے ثابت کیا کہ وہ ہمت ہار کر بیٹھ جانے والوں میں نہیں ہیں۔ انہوں نے ویل چیئر پر باسکٹ بال کھیلتے ہوئے مسلسل تین دفعہ چیمپین شپ جیتی۔ لیکن ان کی توجہ کینسر ہسپتال کی طرف تھی۔ اُنہیں لگتا تھا کہ اس شعبے پر بہت کم پیسہ لگایا جا رہا ہے جب کہ ضرورت بہت زیادہ ہے۔ اُن کی آنکھوں کے آگے وہ کینسر کا شکار مریض آتے رہتے جو جیسے تیسے اپنے دن پورے کر رہے تھے۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کینسر کے لیے جدید سہولیات والا ریسرچ سینٹر بنائیں گے۔

لہٰذا انہوں نے 12 اپریل 1980 کو فنڈز جمع کرنے کے لیے ہوپ میراتھن کا آغاز کیا۔ اُنہیں امید تھی کہ وہ اگر کینیڈا کے ہر فرد سے ایک ڈالر بھی حاصل کرنے میں کامیاب رہے تو ریسرچ سینٹر کے لیے 24 ملین ڈالر جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آغاز میں انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں نے اُن کے ساتھ خاص تعاون نہیں کیا۔ لیکن وہ

ڈٹے رہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کامیاب ہونے لگے۔ پورے کینیڈا کے لوگوں نے اُن کا بھرپور ساتھ دینا شروع کر دیا۔ بے شمار لوگ اُن کے گزرنے والے راستے میں کھڑے ہوتے۔ اور بے شمار ڈونیشن جمع کرواتے۔

اسی دوران ایک دن بھاگتے ہوئے اُنہیں سینے میں شدید درد ہوا اور سانس رکنے لگی تو انہیں فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں پہنچ کے انکشاف ہوا کہ اُن کا کینسر ٹانگ سے پھیپھڑوں تک پہنچ گیا ہے۔ اور ان کے پاس فقط چار پانچ ماہ زندگی کے باقی ہیں۔ اُنہیں ہر طرح سے اس میراتھن کو چھوڑ دینے کا کہا گیا لیکن وہ نہیں رکے۔ اُنہوں نے کہا وہ چل نہ سکے تو وہ رینگ لیں گے لیکن وہ اپنے مشن سے نہیں ہٹیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ چندہ جمع کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی آخری سانسوں تک ساڑھے پانچ ہزار میل کا سفر پیدل طے کیا۔ اُنہیں خصوصی ایوارڈز دیے گئے۔ ''نیشنل ہیرو'' کا اعزاز دیا گیا۔ بے شمار بلڈنگز، پارکس اور سڑکوں کو اُن کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ وہ نہ صرف کینیڈا کے لیے بلکہ پوری دنیا کے ہیرو بن گئے۔ ''ٹیری فوکس'' خود تو 28 جون 1981 کو صرف 22 سال کی عمر میں دنیا سے چلے گئے لیکن کینسر کے لاکھوں مریضوں کے لیے تقریباً 55 ارب روپے اکٹھے کر کے دے گئے۔ آپ ذرا اندازہ کریں اتنی رقم اگر وہ اپنے لیے کمانا چاہتے تو شاید کئی سو سال لگ جاتے۔ لیکن اُنہوں نے اپنی ذات کو بھول کر جب دنیا کا سوچا تو صرف 9 ماہ میں اتنی بڑی رقم کینسر کے لیے دے گئے جس سے جانے کتنے لوگوں کی زندگیاں بچ گئی ہوں گی۔ وہ اکیس سال اپنے لیے جیے تو اُنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ فقط 9 ماہ اس دنیا کے لیے جی کر گئے اور پوری دنیا کے ہیرو قرار پائے۔ اس کہانی میں سمجھنے والوں کے لیے بے شمار سبق ہیں اگر وہ سمجھنا چاہیں تو۔ خود سے سوال کیجیے۔

آپ کس کے لیے جی رہے ہیں؟

اس وطن کو بھی ''ٹیری فوکس'' کی سوچ کی سخت ضرورت ہے۔ جو دوسروں کے لیے جینا چاہیں۔ یہاں بھی لوگ کبھی ڈاکٹر نہ ملنے سے کبھی دوائی نہ ملنے سے اور کبھی ہسپتال نہ پہنچ پانے کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ یہاں بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ایدھی جیسی سوچ کو زندہ کر دیں۔ جو خود کو بھلا کر لاکھوں کو زندگی دے دیں۔ جو اس وطن کے جوانوں کو شعور سے نواز

دیں۔ جو اس وطن کے لیے ایک ہو جائیں۔ میرا وطن آپ سے ایسی سوچ، ایسی کوشش، اور ایسی عظمت کی امید رکھتا ہے۔ میرے وطن کی امید بن جائیں۔ اپنے حصے کا چاہے ایک چراغ روشن کر جائیں۔ یقین کریں اس ایک چراغ سے بھی لاکھوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کبھی بھی معمولی نیکی کو چھوٹا نہ سمجھیں۔ آپ دنیا نہیں بدل سکتے کوئی بات نہیں آپ خود کو تو بدل سکتے ہیں۔ خود سے آغاز کر دیجیے یہ دنیا خود بخود بدلتی جائے گی۔ اس وطن کی مٹی آپ کے عملی قدموں کی منتظر ہے۔

"اپنی دنیا پیدا کرنے والوں کے لیے لمحے صدیوں کا کردار ادا کرتے ہیں"

❁❁❁
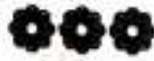
# جیا ہائکسیا اور جیا وینکی

## Jia Wenqi and Jia Haixia

**نابینا اور بازوؤں سے محروم دو ایسے دوستوں کی داستان جنہوں نے صحرا کو سبزے میں بدل کر ایک گلستان بنا دیا**

اگر آپ کا تعلق کسی گاؤں سے ہے تو آپ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہوں گے کہ گاؤں میں معذور افراد کی زندگی کیسے گزرتی ہے اور گاؤں بھی ایسے ملک کا جو آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہو۔ ایسے افراد اکثر خاندان پر بوجھ تصور کیے جاتے ہیں۔ اور معاشرے کا رویہ رفتہ رفتہ اُن کو اندر ہی اندر ختم کر دیتا ہے اور ایسے افراد کی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں

اس کہانی کے دو لڑکوں کا تعلق بھی چین کے ایک گاؤں سے تھا۔ اور یہ بھی کئی سال تک گمنامی کی زندگی گزارتے رہے۔ لیکن پھر اچانک ان دونوں نے مل کر اپنی معذوری والی بے کار اور بوجھ والی زندگی کو کسی مقصد پر لگانے کا عہد کیا۔

غربت اور پسماندگی کے باعث اُنہیں اور کوئی کام تو نہ سوجھا جو وہ اپنے وسائل میں رہ کر کر سکتے لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے صوبے کی ویران زمینوں کو جنگلات میں بدل کر آنے والی نسلوں کو ایک خوبصورت مستقبل دیں گے۔

ہر صبح وہ اپنے اوزاروں کے ساتھ اس کام کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اُنہوں نے طے کیا کہ وہ ابتدائی طور پر وہ اپنے گاؤں کے اردگرد درخت لگائیں گے تا کہ اُن کا گاؤں طوفانوں سے بھی محفوظ ہو جائے اور اُن کے لوگوں کی بنجر زمینیں بھی آباد ہو جائیں۔

کہانی کی سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ ان دونوں دوستوں میں سے ایک نابینا ہے جب کہ دوسرا دونوں بازوں سے محروم ہے۔ بازوں سے محروم ''وینگی'' اپنے نابینا دوست کی نہ صرف منزل تک روزانہ رہنمائی کرتا ہے بلکہ اُسے اپنے کندھوں پر بیٹھا کر روزانہ دریا بھی پار کراتا ہے۔

اور یہ دونوں دوست باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی آنکھیں اور بازو بن کر ایک عظیم مقصد پر لگ گے۔ دونوں ایک دوسرے کا حوصلہ تھے اور نارمل افراد کی طرح زندگی گزارنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ وینگی گردن اور کندھوں کی مدد سے بل چلاتا تھا اور اس درخت لگانے کے مشن میں نابینا دوست کا ہاتھ اُس کا کام آسان کر دیتے۔ ان دونوں دوستوں نے مل کر 13000 سے زائد درخت لگائے۔ اور اس طرح جس مشن کو پورا گاؤں ناممکن کہتا رہا وہ ایک خوبصورت جنگل کی شکل میں سب کے سامنے تھا۔

یہ دونوں دوست معذوری کے باوجود اگر اپنے ملک کو اپنے لوگوں کو اتنا خوبصورت تحفہ دے سکتے ہیں تو آپ کا اپنے وطن اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ خود سے سوال کریں کہ اگر آپ اس وطن کو کچھ دینا چاہیں تو وہ کیا ہو سکتا ہے کیسے ہو سکتا ہے اور آپ اسے کیسے ممکن بنانے جا رہے ہیں؟

سوچنے کی بات ہے ایک نابینا شخص جس نے ساری زندگی سبزہ، ہریالی اور درختوں کی خوبصورتی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی کیسے اپنی زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی فقط اس لیے کہ آنے والی نسلیں خوش ہوں گی۔ اُن کے لیے آسانی ہو گی۔ اسی کو تو کہتے ہیں دوسروں کے لیے جینا۔ کاش ہم سب کو بھی دوسروں کے لیے جینا آ جائے۔ ہمیں سمجھ آ جائے ہماری چھوٹی سی

مسکراہٹ کسی کا دن خوبصورت بنا سکتی ہے۔ ہمارا اچھا اخلاق کسی کی خوشی اور عزت میں اضافہ کرسکتا ہے۔ ہمارا لگایا ایک درخت جانے کتنے پرندوں کا گھر اور بچوں کا سائبان بن سکتا ہے۔ ہماری کوشش سے پڑھا ہوا ایک بچہ دنیا والوں کی کتنی محرومیاں دور کرسکتا ہے۔

کاش ہم سمجھ جائیں دل سے کی ہوئی چھوٹی سی نیکی واقعی بڑی ہو کر پہاڑ بن جاتی ہے۔ وہ جانے کتنے لوگوں کی زندگی بدل سکتی ہے۔ دوسروں کی طرف ہمیشہ دیکھتے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ خود قدم اُٹھا لیا جائے۔ چاہئے وہ قدم کتنا چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ بس اُس کی سمت درست ہونی چاہیے۔

آج انسانی عقل کے درست استعمال کی وجہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان آدھے جسم کے ساتھ بھی ادھورا نہیں ہے۔ کیوں کہ جسم چاہے جتنا بھی نامکمل کیوں نہ ہو یا انسان اپنی حسوں سے چاہئے محروم ہو مگر جب اور جہاں وہ بامقصد جینے کا ہنر پالیتا ہے اسکی معذوری ایک محرومی بننے کی بجائے اسکی طاقت بن جاتی ہے۔ لیکن مقاصد سے عاری کروڑوں لوگوں کا بھی ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آئیں عہد کریں دوسروں کی سمت میں ایک قدم اُٹھانے کا خود آگے بڑھنے کا۔ اس قدم کو آپ دلوں میں زندہ رہنے کا سفر قرار دیں۔

**"کامیاب لوگ چھوٹے کاموں کو بھی اتنی خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ وہ اُن کی پہچان بن جاتا ہے"**

❀❀❀

# فینی کروسبائے

## Fanny Crosby

ماں اگر مجھے پوچھا جاتا کہ میں بینائی چاہتی ہوں یا نہیں تو
میں نابینا رہنا پسند کرتی تاکہ مرجانے کے بعد میں
جو پہلی ہستی دیکھتی وہ خدا کی ہوتی

دنیا کا قانون ہے ہر روز ہزاروں لاکھوں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اتنے ہی واپس چلے جاتے ہیں۔مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا خلا لاکھوں لوگ مل کر بھی پورا نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ان کا جینا بھی لوگوں کے لیے ہوتا ہے اور ان کا مرنا بھی۔ایسے لوگوں کے جانے پر کروڑوں دل روتے ہیں۔''فرانسس جینی'' جو بعد میں ''فینی کراس بے'' کے نام سے مشہور ہوئیں، کا شمار بھی کچھ ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

''فرانسس جینی'' 24 مارچ 1820 کو نیویارک کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیں۔

پیدائش کے دو ماہ بعد وہ بیمار ہوئیں۔ اس وقت ان کا فیملی ڈاکٹر کسی دوسرے شہر میں تھا۔ انہوں نے ایک ایسے ڈاکٹر کو چیک کرایا جو کہ دراصل جعلی ڈاکٹر تھا۔ اس نے اُن کی آنکھوں پر ایسی دوا کا استعمال کیا جس کی وجہ سے اُس کی بینائی ضائع ہوگئی۔ اس حادثے کے چند ماہ بعد جینی کے والد بھی وفات پا گئے۔ ''جینی'' کے والد کی وفات کے بعد گھر کے حالات ایسے ہوئے کی اُس کی والدہ نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا اور جینی کی پرورش اُن کی دادی نے شروع کردی۔ وہ ''جینی'' کو اُس دنیا کی ساری کہانیاں سناتی جسے وہ دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ جینی کی روح میں خوبصورتی بھرنے میں اُس کی دادی کا بہت اہم کردار تھا۔ وہ اکٹھی مل کر پرندوں کا چہچہانا سنتیں اور جب کوئی نیا پرندہ آ کر چہچہاتا تو جینی فوراً پہچان لیتی اور اُس کے بارے میں معلومات لیتی۔ وہ دادی کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر درختوں اور کھیتوں میں گھومتی رہتیں اور سیکھتی رہتیں۔

''جینی'' کو بچپن میں نابینا ہونے کی وجہ سے والدہ نے ایک بھیڑ لے دی۔ وہ اُس کے ساتھ کھیل کر بہت خوشی محسوس کرتیں اور کئی گھنٹے اُس کے ساتھ گزارتیں۔ وہ نابینا ہونے کے باوجود باقی بچوں کے ساتھ کھیلتیں، کھیتوں میں بھاگتیں، اُن کے ساتھ درختوں پر چڑھتیں اور زندگی کو خوب انجوائے کرتیں۔ لکھنے سے اُن کی محبت چھوٹی عمر سے ہی نظر آنے لگی۔ 8 سال کی عمر میں اس نابینا لڑکی نے اپنی پہلی نظم لکھی۔

Oh what a happy soul am I,
Although I cannot see,
I am resolved that in this world
Contented I will be.
How many blessings I enjoy
That other people don't
To weep and sigh because I'm blind
I cannot, nor I won't

''ڈاکٹر رُس'' پہلے استاد تھے جنہوں نے باقاعدہ اُن سے دوستی کر کے سکھانا شروع

کیا۔ وہ اُن کی بہت حوصلہ افزائی کرتے اور اُن کا جذبہ لکھنے کے لیے ابھارتے۔ وہ اُنہیں بتاتے کہ ملٹن، ہومر اور آسین جیسے عظیم شعرا بھی نابینا تھے۔ جس سے جینی کے حوصلے مزید بلند ہوتے۔

اپنی چھوٹی سی عمر میں اُنہوں نے بائبل زبانی یاد کر لی تھی۔ ان کی والدہ کی انتھک محنت اُن کی تربیت میں بہت نکھار لائی۔ وہ 23 سال تک نیویارک کے نابینا سکول کا حصہ رہیں۔ 12 سال تک ایک طالبہ کی حیثیت سے اُنہوں نے اپنی گریجویشن مکمل کی اور 11 سال تک ایک استاد کی حیثیت سے اُسی ادارے میں خدمات سرانجام دیں۔

24 سال کی عمر میں اُنہوں نے کانگریس میں اپنے سکول کی نمائندگی کی اور کانگریس کی نابینا مہمان بنیں۔ اس کے بعد ان کی حکومت میں بے شمار لوگوں سے دوستی ہوگئی جو بھی اُنہیں ایک دفعہ ملتا کبھی نہ بھول پاتا۔

1844 میں 24 سال کی عمر میں اُنہوں نے اس دنیا کو اپنی شاعری کی پہلی کتاب مکمل کر کے دی۔ اور فینی کراس بے کے نام سے شہرت حاصل کی۔ وہ امریکہ کی مشہور شاعرہ، گیت کار، اور لکھاری تھیں۔ وہ امریکن تاریخ میں سب سے زیادہ مناجات لکھنے والی شاعرہ کا اعزاز رکھتی ہیں۔ انہوں نے 9000 سے زیادہ مناجات لکھیں اور 100،000،000 سے زیادہ ان کی کاپیاں پرنٹ ہوئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں 1000 سے زاہد سیکولر نظمیں لکھی۔ اُن کی شاعری کی چار کتب باقاعدہ شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اُن کی دو آٹو بایوگرافی نے بھی بیسٹ سیلر کے اعزاز حاصل کیے۔ وہ بے شمار سیاسی گانوں اور ملی نغموں کی بھی لکھاری رہیں۔ اُن کی یادداشت اتنی شاندار تھی کہ ایک دفعہ اُنہوں نے 40 نظمیں اپنی دماغ میں اکٹھی سوچیں اور بعد میں ان کو کاغذ پر اتارا۔

انہوں نے 38 سال کی عمر میں اُس وقت کے مشہور نابینا سکالر ''وان السٹن'' سے شادی کر لی اور خوشگوار زندگی کے 44 سال ایک ساتھ گزارے۔ اللہ نے اُنہیں آنکھوں کے بغیر بھی ایک خوبصورت اور نعمتوں سے بھرپور زندگی دی۔ وہ 11 فروری 1915 کو 94 سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ لیکن دنیا کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے اپنے نقش چھوڑ گئیں۔

آج بھی اُن کی لکھی مناجات اور شاعری لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ ایک نابینا

لڑکی کا اس طرح دنیا کو دیا گیا تحفہ ہمیشہ کے لیے اپنا نقش قائم رکھے گا۔ آپ بھی اپنی اس خوبصورت دنیا کو کچھ ایسا ضرور دے کر جائیں جو کبھی ختم نہ ہو۔ جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ ابھی اس دنیا میں کرنے کو بہت کام باقی ہیں۔

''اس سے پہلے کے خواب پتھر آنکھوں کے ساتھ دفن ہو جائیں بہتر ہے انہیں زندگی دے کر امر کر دیا جائے''

❁❁❁

# اسٹیوونڈر

## Stevie Wonder

آسکر ایوارڈ جیتنے والا بینائی سے محروم دنیا کا مشہور سنگر

کامیاب لوگوں کے ماضی میں جب بھی میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے وہ تمام ناکام لوگوں سے زیادہ مسائل کا شکار نظر آتے ہیں۔ ماضی میں جو طنز، تحقیر، فقرے بازی اور مایوس کن باتیں وہ سن چکے ہوتے ہیں شاید کبھی ناکام لوگوں نے خواب میں بھی نہ سوچی ہوں۔ لیکن ان سب میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ دل چھوٹا کرنے سے، مایوس ہونے سے، حوصلہ چھوڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہی خوبی اُن کو ہر قسم کی پستیوں سے کامیابی کی چوٹیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ''اسٹیو'' کی کامیاب کہانی میں بھی آپ کو شاندار زندگی نظر آئے گی لیکن تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے اُس کے ناکام دنوں کا تصور ضرور کر کے دیکھیں۔ اور کچھ نہیں تو اس کی روزمرہ زندگی کا تصور کرنے کی کوشش کریں۔ پھر آپ کو کامیابی کا حقیقی مطلب سمجھ آسکے گا۔

''سٹیو ونڈر'' 13 مئی 1950 میں پیدا ہوا۔ پیدائش کے کچھ وقت بعد ہی وہ اپنی

بینائی سے محروم ہو گیا۔ یہ 1950 کا زمانہ تھا جب ٹیکنالوجی فقط نام کی تھی۔ نابینا لوگوں کے لیے خود مختار اور کامیاب زندگی محض خواب تھی۔ اور زیادہ تر نابینا افراد محض بھیک مانگ کر اپنا وقت گزارتے تھے۔

لیکن "سٹیو" نے نابینا ہونے کے باوجود 9 سال کی عمر میں ہارمونیم، پیانو اور ڈرم پر اپنی دسترس حاصل کر لی ہوئی تھی۔ 12 سال کی عمر میں وہ سنگر کی حیثیت سے نا صرف مشہور ہونے لگا تھا بلکہ وہ دوست کے ساتھ مل کر اپنا گانا بھی خود ہی لکھتا تھا۔ اسی عمر میں اُس نے اپنی دو البم بھی ریلیز کر ڈالیں۔

"سٹیو" امریکہ کا وہ نابینا شخص ہے جس نے میوزک کی دنیا میں قدم رکھا تو شہرت کی بلندیوں کو چھوتا چلا گیا۔ اس نے میوزک انڈسٹری میں نئے انداز متعارف کرائے اور میوزک کو جدت دی۔ وہ نہ صرف بہترین سنگر کی حیثیت سے مانا گیا بلکہ وہ ایک بہترین، پرڈیوسر اور رائٹر بھی تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں 30 سے زاید مشہور البم ریکارڈ کروائے۔ اور اپنی لازوال پرفارمنس کی وجہ سے 22 سے زاید ایوارڈ جیتے جن میں آسکر جیسا ایوارڈ بھی شامل ہے۔

یہ تھی ایک بغیر آنکھوں کے شخص کی کہانی جو اپنی مہارت کو وقت پر پہچان لیتا ہے۔ اُس پر محنت کرتا ہے اور دنیا کا مشہور گلوکار بن کر بے شمار ایوارڈز اپنے نام کرتا ہے۔ آپ کو اگر لگتا ہے کہ کوئی تعلیم میں کمزور ہے تو اُسے اُس کے حال پر ہرگز نہ چھوڑ دیجیے گا۔ اُس کی مہارت پہچان کر اُس کی رہنمائی کیجیے گا۔ یقین مانیں آپ کی ذرا سی رہنمائی کسی کی زندگی بنا سکتی ہے۔ کسی کو اس وطن کا ہیرو بنوا سکتی ہے۔ آسانیاں بانٹنا اسی کو کہتے ہیں۔

"درست سمت کا تعین جتنی جلدی کر لیا جائے منزل اُتنی ہی جلد یقینی ہوتی ہے"

❁❁❁

# ہیریٹ ٹیوب مین
## Harriet Tubman

وہ نابینا عورت جو غلامانہ زندگی سے لوگوں کی نجات دہندہ بنی

انسانی زندگی کا اگر مطالعہ کریں تو آپ کو غلاموں کی زندگی انتہائی مشکل اور غیر انسانی نظر آئے گی۔ غلامی میں اکثر قومیں جانوروں جیسا سلوک برداشت کرتی رہی ہیں۔ افریقن لوگوں نے تو اس میں انسانیت سوز ظلم برداشت کیے ہیں۔ یہ کہانی بصارت سے متاثرہ ایک ایسی عورت کی ہے جس نے غلامانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ اپنے پورے خاندان کے ساتھ جوانی تک غلام رہی اور بے شمار ظلم برداشت کیے۔ پھر ایک دن وہ تنگ آ کر ایک ایسی دنیا ڈھونڈنے نکلی جو اس ظلم سے ہٹ کر ہو۔ اور وہ کامیاب ہو گئی۔

بصارت کی خرابی کا شکار "ہیریٹ ٹیوب مین" ایک عظیم عورت تھی۔ اس نے 1820 میں ایک غلام گھرانے میں آنکھ کھولی۔ 12 سال کی عمر میں لوہے کا راڈ سر میں لگنے کی وجہ سے وہ بصارت کی خرابی کا شکار ہوئی۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی حالت میں اچانک سو جاتی تھی۔ اُس

نے اپنی ساری جوانی غلامی میں گزاری جہاں اُس کے ساتھ اور اُس کے والدین کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔

29 سال کی عمر میں وہ اپنی غلامانہ زندگی سے بھاگ کر ''پنسلوینیا'' چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اُسے آزادی کی اہمیت اور خوبصورتی کا احساس ہوا۔ اگر وہ چاہتی تو اپنی ساری زندگی آزادی اور سکون سے گزار سکتی تھی۔ لیکن اُس نے غلاموں کی زندگی کے لیے تحریک چلانے اور اپنی زندگی وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ دوبارہ واپس جائے گی اور اپنے خاندان کے علاوہ باقی غلاموں کو بھی وہاں سے نکال لائے گی۔ اُس نے غلاموں کی آزادی کے لیے 17 خطرناک ترین مشن سرانجام دیے جن میں وہ بے شمار غلاموں کو آزادی دلانے میں کامیاب رہیں۔

وہ اپنی بلند ہمتی اور بہادری کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہوگئیں۔ لوگوں کو غلام بنا کر رکھنے والی تنظیموں نے اُن کو پکڑنے کے لیے ہزاروں ڈالر انعام رکھا۔ لیکن اُن کی جدوجہد میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ دوسروں کی آزادی کے لیے اپنی زندگی سے کھیلنے والی عظیم عورت تھیں۔ وہ لوگوں کے لیے مسیحا کا درجہ رکھتی تھی۔ جنگ کے دوران اُنہوں نے سپاہی کے علاوہ نرس کا کردار ادا کیا اور لوگوں کی بھرپور خدمت کی۔ وہ ایک عظیم عورت تھی جو اپنی محنت اور دوسروں کی خدمت کرکے تاریخ میں اپنا نام رقم کرگئی۔

یہ کہانی آپ کے ہر طرح کے حالات کو کُھلا چیلنج کر رہی ہے۔ زندگی میں آگے نکلنے کے لیے ہمیشہ روٹین سے ہٹ کر کچھ کر دکھانا پڑتا ہے۔ اپنے لیے کوئی بھی شخص کچھ بھی کرسکتا ہے۔ حقیقی کامیابی یہ ہے کہ آپ دنیا کے لیے کچھ کر جائیں۔ لوگ آپ کو مسیحا جانیں۔ وہ آج تک اس لیے زندہ ہیں کیوں کہ انہوں نے فقط اپنے لیے آزادی کو پسند نہیں کیا تھا بلکہ ہر غلام کے لیے جان کی بازی لگائی۔ یہ حقیقت ہے دوسروں کے لیے جینے والے کبھی مرا نہیں کرتے۔

وہ بھی اگر اکیلی آزاد ہوکر واپس نہ جاتی تو آج آپ اُن کی کہانی نہ پڑھ رہے ہوتے۔ آج وہ گمنام عورت ہوتیں۔ اُن کے جانے کے کئی سال بعد بھی لوگوں کے دل اُن کے نام پر نہ دھڑکتے ہوتے۔ اُن کی کامیابی شروع ہی وہاں سے ہوئی جب اُنہوں نے دوسرے غلاموں کے لیے اپنی زندگی وقف کی ان کے حقوق کی جنگ لڑی اور انہیں آج بھی اُن کے

کروڑوں چاہنے والے اپنا اور اپنی نسلوں کا نجات دہندہ قرار دیتے ہیں۔

یہاں خود سے ایک چھوٹا سا سوال کیجیے کہیں آپ کی کامیابی فقط آپ کی ذات کے لیے تو نہیں ہے؟ کہیں آپ سب رشتے گنوا کر اور دوریاں بڑھا کر کامیابی کے خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟ اگر ایسا کچھ ہے تو آپ بدترین ناکامی کے سفر پر ہیں۔

''جو لوگ دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں دنیا انھیں ہمیشہ زندہ رکھتی ہے''

❁❁❁

# انڈریا بوسیلی

## Andrea Bocelli

ایک نابینا گلوکار کی کامیابی کی عظیم کہانی جو قانون میں بھی پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری رکھتا ہے

انسان کی خوشی کا حقیقی تعلق ہمیشہ اُس کے اندر کی ذہانت سے ہوتا ہے۔آپ دنیا گھوم لیں اور لاکھوں لوگوں کی زندگیوں پر تحقیق کر کے دیکھ لیں۔آپ کو یہ بات ثابت ہو جائے گی۔ایک انسان کی ذہانت آرٹس میں ہے آپ اُسے سائنس میں لگا دیں وہ کامیاب ہو کر۔اچھی نوکری حاصل کر کے بھی ناکام رہے گا۔کیوں کہ اُس کا کام اُس کے لیے بوجھ ہو گا۔ اُسے جتنا مرضی معاوضہ ملتے رہے وہ اپنے کام میں کبھی اُس سطح کی خوشی تلاش نہیں کر پائے گا جو اُسے اپنی ذہانت والے کام میں مل سکتی تھی۔اس کتاب میں آپ لوگوں کی تعلیم اور اُن کی کامیابیوں کا موازنہ کر کے دیکھ لیں۔لوگ بڑی بڑی ڈگریاں ہونے کے باوجود وہ عزت وہ مقام نہ پا سکے جو انہوں نے اپنے شوق اور جنون کے پیچھے جا کر حاصل کیا۔یہ کہانی بھی ایک

ایسے ہی شوق کی ترجمانی کرتی ہے۔

''انڈریا'' 1958 میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ وہ آج کی دنیا کا بہترین اور کامیاب ترین گلوکار مانا جاتا ہے۔ اُسے بچپن ہی سے گلوکاری کا شوق تھا۔ اس جذبے کی وجہ سے اُس نے 6 سال کی عمر میں پیانو بجانا سیکھ لیا تھا۔ وہ خاندان کی چھوٹی پارٹیوں میں اکثر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا۔ یہ کامیابی، ناموری اور شہرت اُسے آسانی سے نہیں مل گئی۔ وہ 12 سال کی عمر میں فٹبال سر میں لگنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو گیا تھا۔ بچپن میں وہ اپنی کلاسز کی فیس دینے کے لیے بار میں پیانو بجاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب حقیقت میں اُس کی زندگی میں فقط اندھیرے ہی تھے۔

1980 تک اُس نے گلوکاری کو پروفیشن کے طور پر شروع نہیں کیا تھا بلکہ اس نے پوری توجہ اپنی تعلیم کی طرف رکھی۔ اُس نے قانون میں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی 1993 میں پہلی دفعہ اُس نے گلوکاری کے لیے باقاعدہ معاہدہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ گلوکاری کی دنیا میں چھاتا چلا گیا۔

اُس نے ہالی وڈ میں ہزاروں مشہور گانے ریکارڈ کروائے۔ اُس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ امریکہ میں 3 سال تک مسلسل وہ ٹاپ پوزیشن پر رہا جس کی وجہ سے اُس کا نام گینز بک آف دی ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیا گیا۔

اس کے چاہنے والوں کی تعداد آج بھی کروڑوں میں ہے۔ آپ ذرا تجزیہ کریں ایک بندہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے باوجود گلوکار ہی کیوں بنا؟ اُس نے کیوں اپنی تعلیم کو اپنے روزگار کا ذریعہ نہیں بنایا؟ اگر وہ تعلیم ہی میں خدمات دے رہا ہوتا تو آج اُسے کتنے لوگ جانتے ہوتے؟ کیا وہ اتنا کامیاب ہوتا؟ بات سمجھنے کی ہے اگر آپ کی مہارت گلوکاری میں ہے، مصوری میں ہے، یا کسی بھی ایسی چیز میں تو تعلیم سے زیادہ آپ کو انہیں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس دن آپ کی حقیقی مہارت ہی آپ کا روز کا کام بن جائے گی یقین مانیں آپ ایک کامیاب انسان بن جائیں گے اور آپ کو کبھی اپنے کام کا احساس نہیں ہوگا۔ اپنی مہارت کو اپنا پیشہ بنالیں زندگی آسان ہو جائے گی۔

اگر یہ فن آپ کو سمجھ آ گیا ہے تو آج سے یہ سکھانا شروع کردیں۔ بڑے لوگوں کو

اس کی ضرورت ہے لوگوں کو دی گئی ذرا سی رہنمائی اُن کی ساری زندگی بدل سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں آپ ہزاروں افراد کی زندگیاں بدل سکتے ہیں۔ اپنے قیمتی سال برباد نہ کیجیے اپنی ذہانت اور شوق کو پہچان کر سفر کا آغاز کیجیے۔ کامیابی وقت سے پہلے آپ کے قدموں میں ہوگی۔

**''مشکلات اور پریشانیوں کے تمام راستے بڑی خوبصورت جگہ اختتام پذیر ہوتے ہیں''**

✿✿✿

## جیمز تھربر

## James Thurber

ایک نابینا مصنف جس نے 33 کتابیں لکھ کر دنیا میں خود کو منوایا

کچھ لوگوں کی کہانیاں فقط ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے ہوتی ہیں جو ہمیں زندگی کا احساس دلاتی ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ کامیابی میں ناموری کا تعلق آپ کی اپنی محنت سے ہے۔ آپ جتنی محنت کریں گے اُتنا ہی صلہ پائیں گے۔ آپ جتنی بلند سوچ رکھیں گے اُتنا آگے بڑھیں گے۔ لہذا یہ اہم نہیں ہے کہ آپ آج کس حالت میں ہیں۔ کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ آپ کے سامنے کتنی مشکلات کھڑی ہیں۔ اہم اگر کچھ ہے تو وہ آپ کے سوچنے کا انداز، آپ کا ہمت وحوصلہ ہے اور مستقل مزاجی ہے۔ کامیابی کا تعلق حقیقت میں واقعی حالات سے زیادہ خیالات اور عمل کے امتزاج کا نام ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کیسے اس کامیابی کے راہی نے اپنی منزل پائی۔

''جیمز'' 8 دسمبر 1894 کو امریکہ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ کھیلتے ہوئے سر میں چوٹ لگنے سے سات سال کی عمر میں اپنی بینائی سے محروم ہو گیا تھا۔ اُس کی معذوری نے کچھ عرصہ کے لیے اُسے شرمیلا اور عجیب سی شخصیت کا حامل بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت کھویا سا رہتا اور لوگوں سے دور بھاگتا تھا۔ سکول میں وہ کسی بھی کھیل میں حصہ نہیں لے پاتا تھا۔

وہ اپنی تعلیم میں پھر بھی مگن رہا۔ لیکن اُس کے سامنے مستقبل کا خاکہ غیر واضح تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ وہ اپنی معذوری کے ساتھ زندگی میں کیا کر پائے گا۔ لیکن وہ جواب ڈھونڈنے سے قاصر رہا۔ اُس نے گریجویشن کی اور گورنمنٹ میں کوڈ کلرک کے طور پر خدمات سرانجام دینی شروع کر دی لیکن وہ جلد ہی اس کام سے بے زار ہو گیا۔ 1925 میں اُس نے نیویارک جا کر رپوٹر کی نوکری شروع کر دی۔ یہاں اُس کا کام لکھنے لکھانے والا تھا۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُسے لکھنے سے محبت ہے۔ اور پھر یہاں سے تبدیلی کا ایک سفر شروع ہوا۔ بے شک خوش نصیب ہوتے ہیں وہ انسان جو اپنی مہارت یا قابلیت کو پہچان لیتے ہیں۔ اُس نے بھی جب اپنی مہارت کو پہچانا تو اُس کی دنیا ہی بدل گئی۔ اُس نے ذہنی تخلیقات کو کاغذ پر اتارنے کا کام شروع کر دیا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ بے شمار کتابیں لکھنے والا، اپنے وقت کا بہترین مزاح نگار۔ لاتعداد کارٹون بنانے والا، جس کی لکھی کہانیوں پر فلمیں اور ڈرامے بنائے گئے۔ جس نے بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبولیت حاصل کی وہ شخص نابینا ''جیمز'' ہی تھا۔

یہاں سے اُس کی حقیقی کامیابی کا سفر شروع ہوا۔ اُس نے 33 کتابیں لکھیں، 36 سے زائد شارٹ سٹوریز لکھیں۔ دو ڈرامے اور بے شمار کارٹون اُس کی قابلیت اور تخلیقی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ایک نابینا شخص کا 33 کتابیں لکھ دینا ہی اتنی بڑی کامیابی ہے جس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔

اگر آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں تو آپ خوش نصیب ہیں لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو آپ غلط راستے پر ہیں۔ اپنی ذات کا تجزیہ کریں کہیں کوئی جیمز جیسا لکھاری آپ کے اندر موجود تو نہیں۔ اور آپ اپنی صلاحیتیں کسی ایسے کام میں لگا رہے ہیں جس میں آپ کے لیے کوئی شوق نہیں۔ جو آپ کی کسی صبح میں کوئی تحریک پیدا نہیں کر پاتے۔ بے زاری کی ساتھ

اپنے کام پر جانے والا دنیا کا ہر شخص اپنی ذہانت سے ہٹ کر کام کر رہا ہے۔ جب آپ خود سے سوال کرنا سیکھ لیں گے تو یقین مانیں کامیابی اور خود شناسی کا حقیقی سفر شروع ہو جائے گا۔

"آپ کا شوق اور جنون منزل کی گارنٹی کا کردار ادا کرتے ہیں"

❁❁❁

# برائن مکیور
## Brian McKeever

**ایک ایسا نابینا شہری، جس نے کھیل کے میدان میں متعدد میڈل جیت کر کینیڈا کا نام روشن کر دیا۔**

آپ نے زندگی میں بہت سے ایسے کھلاڑی شاید دیکھے ہوں جو کسی ایک کھیل میں جیت کے یا پھر ایک میڈل حاصل کر کے ساری زندگی اُسی جیت کے گن گانے میں گزار دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اُن میں قابلیت نہیں ہوتی۔ انہوں نے فقط اپنی منزل ہی محدود رکھی ہوتی ہے۔ وہ یا تو تھوڑے پر راضی ہو جاتے ہیں اور مزید کے لیے کوشش چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی افراد کے لیے نابینا برائن کی زندگی کی مختصر کہانی حاضر ہے۔ آپ اُس کی جیت کو ماپنے کی کوشش ضرور کیجیے گا۔

برائن 18 جون 1979 کو کینیڈا میں پیدا ہوا۔ اُس نے 3 سال کی عمر میں ''اسکیئنگ'' کرنا شروع کی اور صرف 13 سال کی عمر میں وہ اس کے مقابلوں میں حصہ لینے

لگا۔ 19 سال کی عمر میں ایک بیماری کی وجہ سے اُس کی نظر ضائع ہونا شروع ہوگئی۔

اُس نے 2002 کے ''پیرااولمپک'' مقابلوں میں حصہ لیا اور پہلی ہی دفعہ دو ''گولڈ میڈل'' اور ایک ''سلور میڈل'' اپنے نام کر کے دنیا کو حیران کر گیا۔۔ ایف آئی ایس عالمی مقابلے جو جاپان میں منعقد ہوئے ان میں اُس نے مسلسل تین سال تک (2004،2003،2002) نابینا افراد میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اُس نے دوبارہ 2006 کے ''پیرااولمپک'' مقابلوں میں حصہ لیا اور دو ''گولڈ میڈل''، ''برونز میڈل'' اور ایک ''سلور میڈل'' اپنے سینے پر سجا کر واپس لوٹا۔

2010 میں وہ دنیا کا پہلا فرد تھا جس نے ایک ہی سال میں ''پیرااولمپک'' (معذور لوگوں کے مقابلے) کے ساتھ ''اولمپکس'' (نارمل افراد کے مقابلے) میں بھی حصہ لیا اور تین ''گولڈ میڈل'' حاصل کیے۔ 13-2012 میں اُس نے بصارت سے متاثر ہونے کے باوجود عالمی چیمپئن شپ میں دو ''گولڈ میڈل'' حاصل کر کے ایک بار پھر دنیا کو حیران کر دیا۔

اُس نے 2014 میں دوبارہ مقابلوں میں حصہ لیا اور ایک دفعہ پھر سے وہ فاتح ٹھہرا۔ اُس نے تین گولڈ میڈل اپنے نام کر کے ایک نیا ریکارڈ بنا ڈالا۔ اس طرح مجموعی طور پر وہ ابھی تک 13 میڈل حاصل کر چکے ہیں لیکن اُن کے کھیلوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔

نارمل اور سپیشل دونوں طرح کے مقابلوں میں حصہ لے کر اور ''گولڈ میڈل'' حاصل کر کے اُس نے حقیقی معنوں میں ایک تاریخ رقم کر ڈالی۔ اُس نے بیس کلومیٹر، دس کلومیٹر اور ایک کلومیٹر جیسے رننگ کے تمام مقابلوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کی اور خصوصی فرد ہوتے ہوئے بھی اپنے ملک کا نام پوری دنیا میں روشن کیا۔

سوچنے کا مقام ہے جن نابینا افراد کو آگے بڑھنے کے لیے قدم قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ اُن کو عالمی مقابلوں میں حصہ لینے، کئی کلومیٹر تک دوڑنے اور جیتنے کے لیے کتنی محنت اور حوصلہ درکار ہوتا ہوگا۔ یہ سب اگر آپ سمجھنے سے قاصر ہیں تو کسی دن آنکھوں پر پٹی باندھ کر فقط ایک کلومیٹر دوڑنے کی کوشش کیجیے گا۔

اگر ممکن ہو تو زندگی کا ایک اصول بنالیں۔ آپ کو اگر کسی بھی انسان میں کچھ اچھا یا خاص نظر آئے تو برائے مہربانی اُس کی تعریف ضرور کریں۔ اُسے اُسکی خوبی کا احساس ضرور

دلائیں۔شاید آپ کی تھوڑی سی تعریف اُسے اس کی مہارت سے روشناس کرادے اور نہ صرف وہ اپنی دنیا بدل لے بلکہ اس ملک کا ستارہ بن جائے اور لاکھوں کا رول ماڈل ہو۔لہٰذا خود سے وعدہ کریں آپ ہر انسان کو اُس میں جو بھی کچھ خاص ہوگا اُس کا احساس دلانے میں کنجوسی سے ہرگز کام نہیں لیں گے۔

''بلند سوچ ہی بلند منزلوں کی ضامن ہے۔چھوٹی سوچ کے ساتھ آپ کبھی بڑا کام نہیں کر سکتے''

❀❀❀

# مارلا رنیان

## Marla Runyan

ایک نابینا چمپین کوچ اور موٹی ویشنل سپیکر کی کامیابی کی کہانی

دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہیں ہم چہرے سے تو پہچان سکتے ہیں، لیکن اُن کے نام سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ''مارلا رنیان'' بھی ایسی ہی لڑکی ہے جن کی تصویریں اکثر اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ایک نابینا لڑکی ہے جنہوں نے دوڑ میں عالمی ریکارڈ بنا رکھے ہیں۔

''مارلا رنیان'' چار جنوری 1969 کو امریکہ میں پیدا ہوئیں۔ 9 سال کی عمر میں آنکھوں کی بیماری کی وجہ سے وہ تقریباً نابینا ہوگئیں۔ اُنہوں نے 1987 میں اپنی گریجویشن مکمل کی اور ''سان ڈیاگو یونیورسٹی'' چلی گئی جہاں اُنہوں نے مختلف کھیلوں میں حصہ لینا شروع کر لیا۔ جہاں اُنہیں احساس ہوگیا کہ وہ تعلیم سے زیادہ کھیلوں میں آگے جاسکتی ہے۔ لیکن انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ تعلیم کو بھی ساتھ جاری رکھے گی۔ اُنہوں نے کھیلوں میں حصہ لینے کے

لیے زیادہ پریکٹس شروع کردی۔ وہ اپنے آپ کو ساری دنیا میں منوانے کا عہد کر چکی تھیں۔ اور اُنہیں خود پر یقین تھا کہ وہ یہ نہ صرف ممکن کر کے دکھائیں گی بلکہ اپنی کامیابیوں سے پوری دنیا کو حیران کردیں گی اور اپنے وطن کا نام روشن کریں گی۔

پھر یہ محنت اور جنون انہیں خوب صلہ دیتا ہے اُنہوں نے 1992 میں ''لانگ جمپ'' کے علاوہ ایک سو، دو سو اور چار سو میٹر کے مقابلوں میں پہلی ہی مرتبہ چار ''گولڈ میڈل'' حاصل کر لیے اور پھر دو سال بعد اپنی اپنی ماسٹرز کی ڈگری مکمل کی۔ 1996 میں مقابلے شروع ہوئے تو وہ پھر میدان میں موجود تھیں۔ اس دفعہ وہ ''شاٹ پٹ'' میں ''سلور'' اور ''پینٹا تھلون'' میں ''گولڈ میڈل'' حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ عالمی کھلاڑی کی حیثیت سے اُن کا کیریئر 2000 میں شروع ہوا، جہاں وہ 1500 میٹر کی ریس میں ''گولڈ میڈل'' اپنے نام کرنے میں کامیاب رہیں۔

اگلے سال اُنہوں نے اولمپک میں پہلی باقاعدہ نابینا ''ایتھلیٹ'' کا اعزاز حاصل کیا اور 1500 میٹر میں نارمل افراد کے ساتھ آٹھویں پوزیشن پر رہیں۔ 2001 میں وہ 5000 میٹر میں مسلسل تین مرتبہ نیشنل چیمپئن بنیں، جو کہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے، اکثر لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

2002 میں وہ پانچ کلو میٹر اور دس کلو میٹر کی نیشنل چیمپئن شپ میں شامل ہوئیں۔ انہوں نے ٹاپ امریکن وومن کے اعزاز کے ساتھ اپنا فاصلہ 2 گھنٹے 27 منٹ اور دس سیکنڈ میں طے کیا، جو کہ اب تک اُن کا اعزاز ہے۔ 2003 کے مقابلوں میں وہ دوبارہ کامیاب ہوئیں۔

''رنیان'' نے ایسے مقابلوں میں گولڈ میڈل حاصل کیے جو نارمل کھلاڑیوں کی زندگی کا خواب ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی آٹو بائیوگرافی ''نوفنیش لائن'' (NoFinish Line) اور ''مائی لائف ایز آئی سی'' (My Life as I see) کے نام سے لکھیں۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل نابینا افراد کی سکول ایمبسڈر، کوچ اور موٹی ویشنل اسپیکر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

دنیا میں تاریخ رقم کرنے والے افراد ہرگز کچھ زیادہ لے کر نہیں آتے۔ وہ صرف

اپنی مہارتوں پر کام کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے خاندان اور اپنے ملک کے لیے خوب محنت کرتے ہیں۔ اور جب یہ محنت اُن کو صلہ دینے لگتی ہے تو لوگ رشک سے اُن کی طرف دیکھتے ہیں۔ آپ بھی اپنی مہارتوں میں مزید نکھار پیدا کر کے اس وطن کا نام روشن کر سکتے ہیں۔

**"ساری دنیا سے جیتنے سے پہلے اپنے اندر کی خواہشوں سے جیتنا پڑتا ہے اور یہی حقیقی جیت ہے"**

❁❁❁

# ڈاکٹر طٰہٰ حسین

## Dr Taha Hussain

پانچ پی۔ایچ۔ڈی کا اعزاز رکھنے والا ایک نابینا شخص جو وزیر تعلیم بنا

گزشتہ کئی سالوں سے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بہت سے دوست اور ساتھی پی۔ایچ۔ڈی لیول کے زندگی میں شامل رہے۔لیکن کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو سمجھتا ہو یہ تعلیم آسان ہے۔یہ ریسرچ کی بنیاد پر ملنے والی ڈگری ہے جس کو حاصل کرنے میں انسان کی ساری صلاحیتیں اور کئی سال صرف ہو جاتے ہیں۔جب میں نے سُنا کہ دنیا کا ایسا نابینا بھی ہے جو پانچ پی۔ایچ۔ڈی کا اعزاز رکھتا ہے تو میں نے ضروری سمجھا کہ آپ سے بھی یہ شیئر کروں تاکہ ایسی تعلیم جس میں اکثر لوگ اپنا حوصلہ ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اُن کے لیے وہ باعث حوصلہ ہو۔

طٰہٰ حسین 14 نومبر 1889 کو بالائی مصر کے ایک گاؤں ''مغاغہ'' کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد ایک شوگر کمپنی میں ملازم تھے۔بچپن میں ''طٰہٰ حسین''

کی آنکھیں خراب ہوئیں تو ایک عطائی کو دکھایا گیا جس کے غلط علاج سے وہ 3 سال کی عمر میں ہمیشہ کے لیے نابینا ہو گئے۔ ''طٰہٰ حسین'' نے اپنی تعلیم اپنے دادا سے سیکھ کر شروع کی، پھر ایک قطب یعنی قرآن سکھانے اور ابتدائی تعلیم دینے والا مدرسہ میں داخل ہوئے اور ابتدائی تعلیم مکمل کی۔

1902 میں انہیں ''الازہر'' بھیج دیا گیا، جہاں انہوں نے 6 سال رہ کر عربی زبان وادب اور علوم اسلامیہ کی تعلیم مکمل کی۔ برطانوی راج کے دوران میں 1908 میں قاہرہ یونیورسٹی بنی تو وہاں بڑے شوق سے داخل ہوئے۔ وہ پہلے طالب علم تھے جنہیں اس یونیورسٹی نے 1914 میں ''ابوالعلامعری'' پر مقالہ لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ اسی یونیورسٹی میں وہ عربی ادب کے پروفیسر تعینات ہو گئے۔

حکومت مصر نے 1915 میں ''طٰہٰ حسین'' کو مزید تعلیم کے لیے فرانس بھیجا۔ ''طٰہٰ حسین'' نے 1918 میں ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ پر ریسرچ پیپر لکھا۔ جس پر ''سوربون آرٹس کالج، پیرس'' نے 1919 میں انہیں دوسری پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ 1919 ہی میں یہیں سے رومن قوانین میں ڈپلومہ حاصل کیا، اسی سال مصر لوٹ آئے اور جامعہ مصریہ قاہرہ میں قدیم رومی و یونانی تاریخ پڑھانے لگے۔ آکسفورڈ، میڈرڈ اور روم کی یونیورسٹیوں نے ''طٰہٰ حسین'' کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

''طٰہٰ حسین'' یقیناً دنیا کے واحد نابینا ہیں، جو اتنی پی۔ ایچ۔ ڈیز کا اعزاز رکھتے ہیں، جن کو دنیا کی بہترین یونیورسٹیز نے اس قابل سمجھا۔ ''طٰہٰ حسین'' کی کامیابیاں بہت زیادہ ہیں، جن کا احاطہ اس کتاب میں ناممکن ہے۔ میں فقط کچھ چیزوں کا ذکر کر رہا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ کیسے کیسے لوگ گزرے ہیں جن کے چلے جانے سے یہ گلشن ویران ہو کر رہ گئے ہیں۔

''طٰہٰ حسین'' جب فرانس سے اپنی دوسری پی ایچ ڈی کر کے مصر آئے تو قاہرہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے منسلک ہوئے۔ یونیورسٹی میں آتے ہی انہوں نے طریقۂ تعلیم کو تبدیل کرنے کی سعی شروع کر دی اور اپنا تجویز کردہ منہج نافذ کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

درسی کتابیں پڑھانے کی بجائے انہوں نے علمی وادبی موضوعات پر لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۲۵ء میں طٰہٰ حسین آرٹس کالج میں تاریخ ادب عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں اسی کالج کے پرنسپل بن گئے۔ پھر ۱۹۴۳ء میں انہیں جامعہ اسکندریہ کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ مزید ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ۱۹۵۰ء میں وفد پارٹی کی طرف سے وہ وزیر تعلیم بنائے گئے۔ انھوں نے وزیر تعلیم بننے پر یہ نعرہ اپنایا کہ تعلیم پینے والے پانی اور سانسوں میں جانے والی ہوا کی طرح ہر انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ طٰہٰ حسین ہی کی تحریک سے مصر میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت قرار دی گئی۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت کی طرف سے اُنہیں پاشا کا خطاب دیا گیا۔ صدر ناصر نے انھیں مصر کا سب سے بڑا سول اعزاز دیا۔ ۱۹۷۳ء میں اقوام متحدہ نے حقوق انسانی کا ایوارڈ دیا۔

طٰہٰ حسین نے نصف درجن کے قریب ناول لکھے۔ یورپ میں طٰہٰ حسین اپنی دوسری کتابوں کی بجائے آپ بیتی سے زیادہ مشہور ہوئے۔ طٰہٰ حسین فرانسیسی ادب وثقافت کے شیدائی تھے۔ انھوں نے فرانسیسی ادب کے ایک بڑے ذخیرے کو عربی میں منتقل کیا۔

طٰہٰ حسین فصیح عربی کے زبردست حامی تھے۔ وہ قرآن کی زبان اور اس کے رسم الخط کو عربوں میں رابطہ قرار دیتے تھے۔ عمدہ عربی لکھنے والے اس انشا پرداز کا اسلوب سلیس اور دل چسپ ہے۔ طٰہٰ حسین کی تمام کتابیں دل کش اسلوب اور رواں عربی میں لکھی گئی ہیں، لیکن ''الایام'' کی تحریر تو ایسی ہے کہ انسان پڑھ کر وجد میں آجاتا ہے۔ ''ذکری ابی العلاء''، ''فی الادب الجاہلی''، ''مع المتنبی''، ''فصول فی الادب والنقد''، ''حافظ وشوقی''، ''حدیث الاربعاء''، ''من ادبنا المعاصر''، ''دعاء الکروان''، ''مستقبل الثقافۃ فی مصر''، ''الایام''، ''مرآۃ الاسلام''، ''علی ہامش السیرۃ'' اور ''الوعد الحق'' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

آپ دیکھیں اگر ایک نابینا شخص پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور وزیر تعلیم لگ سکتے ہیں تو آج کے معذور یا عام افراد کیوں پیچھے ہیں۔ کیا یہ اُن کی اپنی

سستی یا کوتاہی نہیں ہے؟ آپ نے زندگی میں کہیں بہت چھوٹے مقاصد تو نہیں رکھے ہوئے۔ یاد رکھیں اگر آپ فقط اپنے لیے زندہ رہ رہے ہیں تو آپ اپنا شمار زندوں میں نہ کریں۔

**"اپنی خامیوں کو بھول کر خوبیوں کو اتنا نکھاریں کے زمانہ آپ جیسا بننے کی خواہش کرے"**

❁❁❁

# البرٹ آئن سٹائن

## Albert Einstein

جس انسان نے کبھی غلطی نہیں کی اُس نے کبھی نیا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ 14 مارچ 1879 کو جرمنی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا سر ضرورت سے زیادہ بڑا تھا۔ وہ بچپن میں عام بچوں سے مختلف تھے اور کسی قسم کی شرارتوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ہر وقت چپ چاپ اور الگ تھلگ رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ تین سال کی عمر تک ایک لفظ بھی بولنے سے قاصر تھے۔ اور 9 سال کی عمر تک ٹھیک سے بولنے سے عاری تھے (Dyslexic,Aspergers Syndrome)۔ والدین کے لیے ان کی عادات پریشانی کا باعث تھیں۔ وہ تنہا رہنا پسند کرتے ان کا سب سے خوبصورت دن بھی اتوار کا ہوتا تھا جب ان کے والد انہیں کسی خاموش اور پُرفضا جگہ لے کر جاتے تھے۔ وہ ایسی جگہوں پر جا کر کھو سے جاتے تھے۔ اور اپنے اردگرد کے ماحول کو بہت توجہ سے دیکھتے رہتے۔ اُن کے دماغ میں

سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ یہ دنیا کام کیسے کرتی ہے؟

اپنی عارضی معذوری کے باعث انہوں نے بہت دیر سے سکول جانا شروع کیا۔ اُن کے لیے سکول ایک جیل کی عمارت تھا جہاں پر ان کی آزادی ختم ہو جاتی تھی۔ انہیں اپنے اساتذہ کی باتیں ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں آتی تھیں۔ وہ زیورخ میں موجود سوئس فیڈرل انسٹی ٹیوٹ میں داخلے کا امتحان بھی پاس نہیں کر سکے تھے۔

انہیں تعلیمی باتیں ادھوری لگتی تھیں وہ اساتذہ سے عجیب عجیب سوال کرتے جس پر اساتذہ ان سے نالاں رہتے تھے اور انہیں "سنکی" اور "پاگل" کہتے تھے۔ اپنے بارے میں ایسی باتیں سن کر انہیں لگتا کہ ابھی ان کا دماغ ادھورا ہے۔ لہٰذا ایک دن انہوں نے اپنے استاد سے پوچھا کہ میں کیسے اپنے دماغ کو تیز کر سکتا ہوں تو استاد نے جواب دیا "سوچ ہی کامیابی کا راستہ ہے" اس بات نے ان کی زندگی ہی بدل دی۔ انہوں نے سوچوں کو مزید بڑھا کر ترقی کا سفر شروع کر دیا۔ طبیعات کے مضمون میں غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے وہ بہت تیزی سے آگے بڑھے اور پھر ساری دنیا نے دیکھا کہ اس گہری سوچوں کے سفر نے انہیں دنیا کا سب سے بڑا سائنسدان بنا دیا۔

عظیم مفکر اور سائنس دان "آئن سٹائن" کا نظریہ اضافیت میں ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی، جدید ترین آلات اور بڑے پیمانے پر وسائل کی دستیابی کے باوجود، دنیا بھر کے ماہرین معمولی سی ترمیم نہیں کر سکے اور اس کے نظریات کی سچائی آج بھی برقرار ہے۔ کچھ عرصہ قبل دنیا کی سب سے بڑی اور مہنگی تجربہ گاہ میں دنیا بھر کے سائنس دانوں کی ایک بڑی ٹیم نے کئی برس کی تحقیق کے بعد یہ دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے روشنی سے بھی تیز رفتار ذرات دریافت کر لیے ہیں، جس سے آئن سٹائن کا نظریہ باطل ہو گیا ہے، مگر چند ہی ہفتوں بعد انہیں اپنا دعویٰ یہ کہتے ہوئے واپس لینا پڑا کہ ان کے نتائج آلات میں تکنیکی خرابی کے باعث درست نہیں تھے۔

"البرٹ آئن سٹائن" غیر ضروری چیزوں کو یاد رکھنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں اپنے فون کا نمبر اور گھر کا نمبر بھی یاد نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی دوست نے انہیں پوچھا کہ ایک میل میں کتنے فٹ ہوتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اپنے ذہن کو اس طرح کی معلومات سے نہیں بھرتا، جو آرام سے مجھے کتاب میں مل سکتی ہیں۔ اس سب کے باوجود وہ دنیا

کے ذہین ترین انسان ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔

''آئن سٹائن'' نے مختلف مواقع پر روزمرہ زندگی کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، ان میں سے اکثر باتیں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے چند مشہور اقوال درج ذیل ہیں۔

① ذہین افراد مسائل حل کرتے ہیں اور فطین (بہت ہی زیادہ ذہین) ان سے اپنی جان بچاتے ہیں۔

② اگر سائنس آپ کی گذر اوقات کا ذریعہ نہ ہو تو دنیا میں اس سے حیران کن چیز کوئی اور نہیں ہے۔

③ میرا اس پر کامل یقین ہے کہ خدا کائنات کا نظام چلانے کے لیے پانسہ نہیں پھینکتا۔

④ صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا، ان میں سے پہلی چیز کائنات ہے اور دوسری انسان کی حماقت ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں کائنات کے لامحدود ہونے کا دعویٰ یقین کے ساتھ نہیں کر سکتا۔

⑤ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ کن ہتھیاروں سے لڑی جائے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ انسان چوتھی عالمی جنگ لاٹھیوں اور پتھروں کے ساتھ لڑے گا۔

دنیا کے ذہین ترین انسان ''البرٹ آئن سٹائن'' نے اس دنیا کو بہت کچھ دیا۔ انہیں دولت سے بالکل بھی محبت نہیں تھی اس لیے بہت زیادہ خیرات کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے آٹوگراف دیتے اور انہیں بہت محبت سے ملتے تھے۔ انہوں نے اپنی ذہانت کو ''طبیعات'' کے مضمون میں پہچان کرانے ترقی کی کہ آج دنیا اُن کے نام کو جانتی ہے۔ اگر وہ اسی ذہانت کو کسی اور طرف لگاتے تو شاید آج آپ ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے، جیسا کہ وہ کالج میں تقریباً باقی سب مضامین میں ناکام بھی ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی ساری توانائی کو ایک طرف لگا کر دنیا کا سب سے بڑا ''نوبل انعام'' حاصل کرنے کا اعزاز بھی اپنے نام کیا۔

آپ بھی خود کو کسی شعبہ میں مخصوص کر کے اور غیر ضروری بوجھ سے دماغ کو محفوظ رکھ کے بہت آگے تک جا سکتے ہیں۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ آپ کی ذہانت آپ کو کس طرف لے جانا چاہتی ہے۔

# آئزک نیوٹن
## Isaac Newton

دنیا کی کوئی بھی ایجاد کسی بڑی سوچ کے بغیر ناممکن ہے

وہ 4 جنوری 1643 کو انگلینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں (Woolsthorpe Manor) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ان کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ وہ پیدائش کے بعد انتہائی کمزور اور بیمار رہے۔ ان کی پیدائش کے تین سال بعد ان کی والدہ نے دوسری شادی کر لی اور انہیں ان کے دادا دادی کے پاس رہنے کے لیے بھیج دیا۔

وہ ٹھیک سے بولنے سے قاصر تھے۔ اپنے اکیلے پن کی عادت کی وجہ سے ان کا کوئی دوست بھی نہیں تھا۔ وہ بچپن ہی سے چاند تاروں میں کھوئے رہتے اور ان کے سوال بھی انہی کے بارے میں ہوتے تھے۔

اپنی بولنے کی معذوری (Epilepsy,Stutter) کی وجہ سے انہوں نے 12 سال کی عمر میں سکول میں داخلہ لیا۔ سکول میں پڑھائی میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کا بہت

زیادہ مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ آخر ایک دن ان کو سکول سے بھی نکال دیا گیا۔

انہی دنوں ان کے سوتیلے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ واپس والدہ کے پاس چلے گئے۔ اب وہ نئے سکول میں جانے لگے۔ ان کے معاشی حالات سخت خراب تھے۔ اب انہوں نے پڑھائی اس جذبے سے شروع کی کہ وہ ثابت کریں گے کہ وہ نالائق نہیں ہیں۔ وہ جلد ہی سکول کے ذہین طلبا میں شامل ہو گئے۔ پھر ان کا داخلہ کالج میں ہوگیا جہاں وہ فیس پوری کرنے کے لیے امیر طلبا کے کام کیا کرتے تھے لیکن جلد ہی ان کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے ان کو کالج کی طرف سے سکالرشپ مل گئی۔ اور اسی کالج میں رہتے ہوئے انہوں نے ریاضی کے قوانین بنانے شروع کر دیے۔

اس سے پہلے کہ وہ گریجویشن سے آگے بڑھتے لندن میں ایک موذی وبا کی وجہ سے واپس گھر آنا پڑا۔ اور اسی گھر میں رہ کر انہوں نے دو سالوں میں حرکت اور گریوٹی کے قانون پر ریسرچ کی اور دنیا نے دیکھا کہ ایک ضدی، کمزور، نالائق اور پاگل کہلوانے والا بچہ جسے سکول تک سے نکال دیا گیا تھا کیسے سائنس کی دنیا کا بادشاہ بنا۔ اپنی سوچوں اور ذہانت سے دنیا میں انقلاب لانے والا نیوٹن کے قانون اور سائنس کا استعمال سائیکل سے لے کر ہوئی جہاز تک میں کیا جاتا ہے۔ اپنے فارمولوں سے دنیا کو بدلنے والے نیوٹن 20 مارچ 1727 کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میرے خیال سے دنیا کا ہر تعلیم یافتہ شخص نیوٹن کے نام سے ضرور واقف ہوگا۔ لیکن بہت کم لوگ ان کے بچپن اور مشکلات کو جانتے ہوں گے جو انہوں نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے برداشت کیں۔ اگر آپ یا آپ کا بچہ آج نالائق ہے یا کمزور ہے تو برائے مہربانی اُسے لیبل مت کیجیے۔ یہ لیبل اگر پکے ہو جائیں تو انسان کی صلاحیتوں کو کھا جاتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس دینے کے لیے حوصلہ اور شاباش نہیں ہے تو اپنی تنقید اور طنز بھی سنبھال کے رکھیے۔ اس دنیا کو بلند حوصلہ لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔

**"تاریخ گواہ ہے بڑے لوگ ہمیشہ دنیا کو دینے والے تھے نہ کہ دنیا سے لینے والے"**

❁❁❁

# جھکماک گھمیر

Jhakmak Ghemeir

اپنی شدید معذوری کو شکست دے کر دنیا میں نام پیدا کرنے والی ایک نیپالی لڑکی

وہ جولائی 1980ء میں نیپال کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ وہ اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد تھی۔۔ ''جھماک'' پیدائش سے ہی ''سی پی چائلڈ'' تھی۔ اگر آپ بھی ''سی پی بچوں'' سے ملے ہیں تو شاید آپ کو اندازہ ہو کہ ان کی زندگی کتنی مشکل ہوتی ہے، یہ کسی کی مدد کے بغیر کچھ بھی کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی پرورش کے لیے والدین کی محنت اور توجہ کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ وہ بھی شروع سے شدید مشکلات سے دوچار تھی۔ وہ نہ تو بول سکتی تھی، نہ اس کے دونوں ہاتھ اس کے کنٹرول میں کام کر سکتے تھے اور نہ ہی وہ آرام سے بیٹھ سکتی تھی۔ لیکن والدین کی بھرپور توجہ اور محنت سے وہ تین سال کی عمر میں بڑی مشکل سے بیٹھنے لگی۔

وہ شروع ہی سے ایک ذہین اور قابل بچی تھی۔ جب وہ سات سال کی ہوئی تو اس

نے ایک نظم سنی۔ جسے وہ خود پڑھنا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنے والد سے پوچھا کہ نظم کیسے پڑھی جاتی ہے۔ والد اس کی دلچسپی کی وجہ سے بہت متاثر ہوئے، لہٰذا انہوں نے یہ کام اپنی بہن کے سپرد کردیا کہ وہ 'جھمکاک'' کو یہ نظم سنائے اور محنت کرکے اس کے اندر کی آواز کو باہر لانے کی کوشش کرے۔ انہوں نے اُس پر خوب محنت کی۔ اس نے اسی طرح سے پڑھنا شروع کیا اور خود پڑھنے اور حروف تہجی کی پہچان میں کامیابی حاصل کرلی۔

اس نے اپنے بائیں پاؤں کے انگوٹھوں کے درمیان قلم کو پھنسا کر لکھنے کی کوشش کی۔ ایک ہفتے میں اس نے نیپالی حروف تہجی لکھنا سیکھ لیے، وہ بولنے سے قاصر تھی لہٰذا وہ اپنے احساسات، خیالات کو لکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

جسمانی معذوری کے باعث وہ ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہ تھی۔ اُس کے لیے اپنے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کام بھی بہت مشکل تھے۔ ہر کام کے لیے اُسے والدہ کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ اپنی زندگی اس طرح بوجھ بن کر نہیں جینا چاہتی تھی۔ اس نے والدہ کا بوجھ کم کرنے کے لیے بڑی محنت ومشقت سے کوشش شروع کی۔ اپنے آپ کو اس قابل بنایا کہ اب وہ پیروں کی مدد سے خود کھا پی سکتی تھی، کپڑے خود طے کرسکتی تھی، بالوں کی کنگھی کرسکتی تھی، کتاب کے صفحات پلٹ سکتی تھی جس میں وہ بے حد سکون اور خوشی محسوس کرتی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی تعلیم سے محبت مزید بڑھنا شروع ہوگئی۔ وہ ٹیلیویژن پر معلوماتی پروگرام دیکھتی اور اخبارات ورسائل میں خبریں پڑھتی۔ اس کی محنت اور اپنے آپ سے کئے وعدے نے لٹریچر کے میدان میں قدم رکھنے کے قابل کردیا۔ پھر وہ لٹریچر میں منہمک ہوئی اور اس نے گزشتہ چھ سات سالوں میں اپنے پاوں کی مدد سے تقریباً پندرہ کتابیں تحریر کیں جو نظم، مختصر کہانیوں، مضامین، گانے اور روزانہ کے معمولات میں سے ہیں۔ اس وقت وہ نیپال میں ایک مشہور ومعروف ادبی شخصیت کے طور پر جانی پہچانی جاتی ہیں۔

'جھمکاک'' نے معاشرے میں نہ صرف اپنے آپ کو منوایا بلکہ کئی ایوارڈز بھی حاصل کیے جن میں ''کابیتارام بال''، ''ساتیہ پرایبوا پوراسکا ایوارڈ''، ''سویکرت ساتیہ پوراسکا ایوارڈ'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کئی تعریفی اسناد مختلف سماجی اداروں سے حاصل کیں۔

"جھلماک" کی زندگی ثابت کرتی ہے کہ محنت اور تعلیم آپ کی زندگی بدل سکتی ہے۔ آپ کو بند کمروں سے نکال کر ساری دنیا کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔ وہ والدین یا معاشرے جو "سی پی بچوں" کو گھروں میں قید رکھتے ہیں، انہیں کسی قابل نہیں سمجھتے انہیں یہ لڑکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک نئے ڈھنگ سے جینے کی دعوت دے رہی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر نیپال جیسے چھوٹے سے ملک میں ایک "سی۔ پی بچی" اس قابل ہو سکتی ہے تو پاکستان سمیت دنیا کا ہر بچہ بھی کوئی نہ کوئی اہلیت ضرور رکھتا ہے۔ لہٰذا ایسے بچوں سے ہرگز مایوس نہ ہوں، انہیں حوصلہ دیں۔ آپ یقین کریں آپ کا حوصلہ اُن کی زندگی بنا سکتا ہے۔

**"دنیا کے ہر "ناممکن" کے اندر ہی "ممکن" موجود ہوتا ہے"**

❁❁❁

# جے پال ریڈی
## J Pal Reddy

معذوری کے باوجود سیاست اور حکومت میں اپنی قابلیت کے بنا پر ترقی کرنے والا شخص

ہمارے ہاں سیاست کا شعبہ کچھ مخصوص خاندانوں تک محدود ہے۔ اور آپ کو شاید ہی کوئی خصوصی فرد اس شعبے میں نظر آئے۔ پاکستان میں اس تحریک کو چلانے کی کافی لوگ کوشش بھی کر چکے ہیں لیکن کوئی نتائج سامنے نہیں آسکے۔ لیکن باقی دنیا کے حالات اس خطے سے مختلف ہیں۔ آپ دنیا بھر میں خصوصی افراد کی اگر کامیابیوں پر نظر دوڑائیں تو آپ کو یہ افراد ''وزیر''، ''گورنر'' سے لے کر ''صدر'' تک کے عہدوں پر نظر آئیں گے۔ ''جے پال ریڈی'' بھی ان افراد میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی معذوری کے باوجود اس شعبہ میں بہت نام بنایا۔

وہ 16 جنوری 1942ء کو ہندوستان کے صوبہ آندھرا پردیش میں واقع ضلع محبوب

نگر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے حیدر آباد میں قائم عثمانیہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ماسٹر کیا۔ وہ جسمانی معذوری کا شکار ہیں جو پولیو کی وجہ سے ہوئی۔ اس لیے وہ بیساکھی کا استعمال کرتے ہیں۔

''جے پال ریڈی'' انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز آندھرا پردیش یوتھ کانگریس میں صدر کی حیثیت سے کیا جو کہ چار سال تک ان کے پاس رہا اس کے ساتھ وہ جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے بھی آندھرا پردیش کانگریس کمیٹی میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ چار مرتبہ آندھرا پردیش اسمبلی کے رکن اور ایم ایل اے بنے۔ 1977ء میں کانگریس چھوڑ کر جنتا پارٹی جوائن کر لی اور جنتا پارٹی کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ 1988 میں انہیں بہترین کارگردگی پر پارلیمینٹیرین ایوارڈ سے نوازا گیا۔

''جے پال ریڈی'' نے اپنے شاندار کیریر میں بے شمار عہدوں پر کام کیا۔ وہ جنتا پارٹی کے نیشنل ایگزیکٹو ممبر اور مستحقین کمیٹی کے چیرمین کے فرائض رہے۔ وہ وزیر اطلاعات ونشریات بھی بنے اور شہری ترقی کے وزیر بھی۔ اس طرح ایک خصوصی فرد نے بھارت کی سیاست میں بے شمار عہدوں پر نہ صرف کام کیا بلکہ اپنے قابلیت کی بنا پر ہر ناممکن کو ممکن کر کے دکھایا۔

''جے پال ریڈی'' کی کامیابیوں کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ خصوصی افراد کسی مخصوص شعبے کے لیے مختص نہیں ہیں۔ وہ جس بھی میدان میں قدم رکھتے ہیں اپنی محنت اور لگن سے اپنی الگ پہچان بناتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی معاملے میں اُن کو کمتر سمجھنا انتہائی چھوٹی سوچ کی علامت ہے۔ یہ کہانی آپ سے زندگی کے ہر میدان میں برابری کا تقاضہ کرتی ہے۔ کسی کی بھی ظاہری کمی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیاوی معاملات میں وہ کسی سے کم ہیں۔ لہٰذا تعلیم سے لے کر جاب تک ہر معاملے میں برابری کا خیال رکھنا ہر انسان کا فرض ہے۔

●●●

# سری کانتھ

## Srikanth

ایک ایسا نابینا لڑکا، جس نے اپنی محنت کے بل بوتے پر معذور افراد کے روزگار کا راستہ ہموار کر دیا۔

دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی روشن زندگی میں کچھ لوگوں کی اندھیری زندگی برداشت نہیں ہو پاتی۔ وہ اندھیروں میں پیدا ہونے والوں کو اس دنیا پر اضافی بوجھ خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ دنیا فقط انہی کے لیے ہے جو مکمل پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے ہی کچھ مایوس لوگوں نے حیدر آباد (بھارت) میں پیدا ہونے والے "سری کانتھ" کے والدین کو ان سے چھٹکارا پانے کا مشورہ دیا کیوں کہ "سری کانتھ" پیدائشی طور پر بینائی سے محروم تھے۔ ان کے خیال میں اُن کی زندگی عمر بھر اُن کے لیے بوجھ ثابت ہو گی۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں خدا کی ذات جن لوگوں پر آزمائش لاتی ہے۔ انہیں برداشت اور حوصلہ پہلے ہی عنایت کر دیتی ہے۔ لہٰذا جن کے گھر "سری کانتھ" پیدا ہوئے وہ

اُس کی تربیت اور پرورش کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بچے کو بھرپور توجہ دیں گے اور اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ انہوں نے اپنی تمام کوششیں ''سری کانتھ'' کو پڑھانے میں صَرف کرنا شروع کر دیں۔

ابتداء میں ''سری کانتھ'' کو متعدد اسکولوں نے داخلہ دینے سے انکار کر دیا، بعد ازاں انہیں خصوصی بچوں کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا جہاں اپنی کلاس میں ٹاپ کرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ چیس اور کرکٹ میں بھی خود کو بہترین کھلاڑی ثابت کیا۔

پھر اس ہونہار بچے نے دسویں جماعت میں 90 فیصد مارکس حاصل کر کے لوگوں کو حیران کر دیا، لیکن اداروں کی بے حسی دیکھیں اس کے باوجود انہیں سائنس میں داخلے کے لیے 6 مہینے کی جدوجہد کرنا پڑی۔ مسلسل محنت اور لگن سے پڑھائی شروع ہوئی اور ''سری کانتھ'' نے اپنے ایک استاد کی مدد سے، جو انہیں لیکچرز ریکارڈ کر کے دیتے تھے ایف ایس سی کے امتحانات میں 98 فیصد مارکس حاصل کیے، اس عمدہ رزلٹ پر ان کا ''مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی'' (ایم آئی ٹی) میں داخلہ ہو گیا جہاں سے انہوں نے 2012 میں گریجویشن بھی اعزازی نمبروں سے کی۔

پڑھائی کے بعد اس نابینا نوجوان نے کاروبار کی دنیا میں قدم رکھا اور ''بولانٹ انڈسٹری'' کی شروعات کیں جس میں آج سینکڑوں افراد کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کامیابی کو خود تک محدود نہیں رکھا بلکہ آج اُن کی کمپنی معذور اور اَن پڑھ لوگوں کو ملازمت دیتی ہے۔

اتنے بڑے مقام پر پہنچنا یقیناً آسان نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر بڑی مشکل کے بعد کامیابی بھی بڑی ہی ہوتی ہے۔ نابینا ''سری کانتھ'' نے ہندوستان کے سابق صدر، اے پی جے عبدالکلام کے ساتھ مل کر نوجوانوں کو معیاری تعلیم کے ذریعے خود مختار بنانے کے پروجیکٹ پر بھی کام کیا۔ آج ''سری کانتھ'' 50 کروڑ روپے مالیت کی کمپنی کے سربراہ ہیں۔

سری کانتھ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ زندگی میں اگر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا جائے تو محرومیاں آپ کے راستے کی دیوار ہرگز نہیں رہتیں اور حقیقی کامیابی تب شروع ہوتی

ہے جب آپ معاشرے کو واپس نوازنا شروع کر دیتے ہیں، ''سری کانتھ'' خود نہ صرف اپنے جیسے سینکڑوں لوگوں کو نواز رہے ہیں اور زندگی میں آگے آنے کے مواقع دے رہے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی تعلیم اور بزنس میں ہر قدم پر ثابت کیا کہ نابینا ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ کا دل اور دماغ اندھا ہے۔ آپ جو کرنا چاہیں، خود کو جس مقام پر بھی لے جانا چاہیں، زندگی آپ کو برابر اور مسلسل مواقع دیتی ہے۔ آپ بس کوشش کرنے والے بن کر دیکھیں۔ یاد رکھیں!

''اگر آپ کسی کو حقیر سمجھتے ہیں تو یہ دراصل آپ کی اپنی حقیر سوچ کی عکاسی ہے''

❀❀❀

# ابے کیورن
## Abbey Curran

### سی۔پی معذوری کے ساتھ کامیابیاں سمیٹنے والی ایک مثالی لڑکی

پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں ''سی پی'' معذوری کے ساتھ بچوں اور بڑوں کی زندگی بہت زیادہ مشکل ہے، اگر اس معذوری کے ساتھ کچھ لوگ کامیاب ہوئے بھی ہیں تو آپ انہیں انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ المیہ یہ نہیں کہ ان کے لیے ہمارے ملک میں سہولتوں کا فقدان ہے بلکہ ستم یہ ہے کہ اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ یہ کامیاب زندگی گزار ہی نہیں سکتے، یہ جس معذوری کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں انہوں نے ساری زندگی محتاجی میں گزارنی ہے۔ میں ان والدین، ان اساتذہ کے لیے اس بچی کی مثال پیش کر رہا ہوں۔

''ابے کیورن'' 1988 میں امریکہ میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوئی۔ وہ ایک ''سی پی چائلڈ'' تھی۔ اُس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی بے بسی والی معذوری کے باوجود آنکھوں میں بڑے خواب سجائے اور ان پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس

نے اپنی تنظیم بنائی جس کا مقصد خصوصی افراد کی ضرورتوں کے لیے کام کرنا تھا۔ اس نے معذوری کے باوجود بزنس کمیونیکیشن میں اپنی گریجویشن مکمل کی اور مسلسل تھیراپی سے اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرتی رہی۔

وہ اپنی کوشش اور محنت سے نہ صرف اخباروں کا سرورق بنی بلکہ وہ یہ سفر طے کرتے ہوئے ٹی وی شوز سے ہالی وڈ کی دنیا میں جا پہنچی۔ زندگی کی شدید مشکلات کے باوجود 20 سال کی عمر میں 2008 میں نہ صرف مس امریکہ منتخب ہوئی بلکہ وہ خصوصی افراد کی ایک تنظیم کی چیر پرسن بھی ہیں۔ ٹی وی چینلز نے ان کی کامیابی پر باقاعدہ ڈاکیومنٹری تیار کی۔ اور ان کی ہمت اور حوصلے کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ وہ آج بھی کامیابی کے ساتھ اپنی تعلیم کے ساتھ نہ صرف اپنے لیے جی رہی ہیں بلکہ اپنے جیسے کئی افراد کی زندگی بدلنے کا عزم لیے ہوئے ہیں۔

یہ کہانی دیکھنے میں بہت چھوٹی لیکن حقیقت میں بہت بڑی ہے۔ وہ بچے جو پانی تک خود نہیں پی سکتے۔ جو اپنی ویل چیئر کو چلانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ جن کو ذرا سے کوشش کے لیے اپنے بدن میں ہر توانائی کو بھرپور استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جو اپنی ذرا سی بات کو سمجھانے کے لیے پسینے سے شرابور ہو جاتے ہیں۔ جن کی بے بسی اُن کے چہرے سے زیادہ اُن کی آنکھوں میں رُکے آنسو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ بچے اگر چھوٹی سی بھی کامیابی حاصل کر لیں تو حقیقت میں وہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

''ابے کیورن'' نے تو کامیابی در کامیابی حاصل کر کے ایک تاریخ رقم کی ہے جسے وہی سمجھ سکتے ہیں جو ان بچوں کے قریب وقت گزار چکے ہیں۔ ''ابے کیورن'' آپ کو کُھلا چیلنج کر رہی ہے کہ اگر میں نہیں رُکی، میں نہیں تھکی، اگر میں نے ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیا تو آپ کے ذمہ اس سے زیادہ کوشش باقی ہے۔ کبھی بھی اپنا حوصلہ مت چھوڑیں۔ یقیناً کامیاب آپ ہی ہوں گے۔

''دنیا میں ہر ناممکن سے ممکن کی طرف کیا گیا سفر خوبصورت ترین اور کامیاب ترین سفر ہے''

❁❁❁

# ڈاون سینڈروم

''ڈاون سینڈروم'' ایسے بچے ہوتے ہیں جو کرموسوم کی وجہ سے ایک خاص سینڈروم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ بچے مڈل یا میٹرک سے آگے نہیں پڑھ سکتے۔

''ڈاون سینڈروم'' کے دماغی اور جسمانی اثرات والے بچے والدین کے لئے بہت بڑا امتحان ہوتے ہیں۔ ایسے بچے اپنے لئے بھی ایک چیلنج کی حثیت رکھتے ہیں جب وہ بڑے ہوتے ہیں۔ والدین عمومی طور پر ایک تندرست بچے کا خواب دیکھتے ہیں۔ والدین کو مایوسی ہوتی ہے جب انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے بچے میں پیدائشی نقص ہے۔ انہیں بہت سے جذباتی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

جب مجھے علم ہوا 90 فیصد سے زیادہ ''ڈاون سینڈروم'' بچوں کے والدین کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ کاش یہ بچے پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔ لیکن ان کی آبادی میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صرف امریکہ میں 4 لاکھ سے زائد ''ڈاون سینڈروم'' بچے ہیں۔ لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کی اوسطاً زندگی جو کہ دس سال تھی، بڑھ کر تقریباً اب 50 سال تک پہنچ

چکی ہے۔ میں نے سب سے زیادہ مایوس انہی بچوں کے والدین کو دیکھا۔ میری بڑی خواہش رہی کہ ان بچوں کی کچھ مثالیں دنیا کے سامنے پیش کرسکوں کہ جنہیں آپ بالکل فالتو سمجھتے ہیں، وہ بھی بہت کچھ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

اس معذوری کے ساتھ کامیاب لوگوں میں آسٹریلیا کے مشہور اداکار ''ڈینی السباغ''، سیاست کی دنیا میں قدم رکھنے والی سپین کی ''انجیلا'' جو کہ سیاسی جماعت کی نمائندہ ہونے کے علاوہ شہر کی کونسلر بھی ہیں۔ امریکہ کے مشہور اداکار ''ایڈورڈ''، ''انڈریو'' اور ''سام برنارڈ''، امریکہ کی مشہور اداکارہ ''جیمی بریور'' اور ''لورین''۔ امریکی مشہور گلوکارہ اور اداکارہ ''کرس برکے''، امریکن بزنس مین ''کولیٹی ڈیوٹو''، بیلجیم میں بہترین اداکار کا ایوارڈ پانے والے ''پاسکل''، معذور افراد کے لیے دنیا میں تحریک چلانے والے پہلے امریکن ''ڈاون سینڈروم کارن گیفنی'' جنہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ ناروے کی ''مارٹی'' جو کہ نا صرف اداکارہ اور لکھاری ہیں بلکہ خصوصی افراد کے لیے تحریک بھی چلا رہی ہیں، انگلینڈ کی اداکارہ ''سارہ گورڈی'' اور اداکار ''ٹومی جوزف''، ''جیسن کنگسلی''۔ سپین کا فلم ایکٹر اور یورپ کا پہلا فرد جس نے ''ڈاون سینڈروم'' کے ساتھ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ انگلینڈ کی ایوارڈ یافتہ اداکارہ ''پاولا سیج''۔ فن لینڈ کی مشہور اداکارہ ''شنا'' اور ان کے علاوہ بے شمار کامیاب لوگ جو آج بھی ''ڈاون سینڈروم'' کے ساتھ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

❁❁❁

# ایلی ریمر

## Eli Reimer

### ایک ڈاون سینڈروم لڑکا جس نے ماونٹ ایورسٹ پر جا کر تاریخ رقم کر دی

جن بچوں کو دیکھ کر لوگ سب سے زیادہ قابل رحم خیال کرتے ہیں۔ اور سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ آخر ان کی زندگی کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ اُن سب کو جواب دینے کے لیے فقط 15 سالہ امریکن ''ایلی ریمر'' ہی کافی ہے۔

میں نے جب اس کے بارے میں جانا تو حقیقت میں کچھ دیر کے لیے ساقط سا ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ سب ''ڈاون سینڈروم'' بچے آئے جو میں اپنی زندگی میں دیکھتا آیا تھا۔ جن میں اکثر کے لیے اپنے بھاری بھر کم جسم کے ساتھ اپنا بستہ تک سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ جب چہرے پر دنیا جہاں کی معصومیت والی مسکراہٹ سجائے میرے پاس سے گزرتے تو میں اکثر سوچتا کہ ان کی زندگی کو کیسے کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ ان کے والدین

کو کیسے امید دی جاسکتی ہے۔ یہ کیسے اپنے وجود کو منوا سکتے ہیں۔ اور آج مجھے فخر ہے اس بچے پر جو میرے بعد آپ کو بھی حیران کرنے والا ہے۔

15 سالہ ''ایلی ریمر'' 2013 میں کالج کا ہونہار طالب علم تھا۔ 21 مارچ کو ''ڈاون سینڈروم'' بچوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ مارچ ہی میں ''ایلی ریمر'' نے نیپال سے گروپ کے سات لوگوں کے ساتھ ماونٹ ایورسٹ کا سفر شروع کیا۔ اس مشکل ترین مشن کا مقصد عالمی سطح پر خصوصی افراد کے حوالے سے آگاہی مہم اور ان کے لیے چندہ اکٹھا کرنا تھا۔ ''ایلی'' اس گروپ کو لیڈ کر رہا تھا۔

اُس نے 70 میل لمبا اور 17500 فٹ بلندی کا یہ سفر دس دن میں طے کیا۔ اُس کا یہ مشکل ترین سفر خصوصی افراد کی فاونڈیشن کے لیے 85000$ سے زائد چندہ جمع کرنے کا سبب بنا۔ 15 سالہ ایلی نہ صرف خود کامیابی سے اپنی اس عظیم منزل تک پہنچا بلکہ وہ سارے راستے گروپ کو لیڈ کرنے کا کام بھی سرانجام دیتا رہا۔ آپ کو جان کر شدید حیرت ہوگی کہ ایلی ریمر دنیا کا پہلا ڈاون سینڈروم بچہ ہے جو دنیا کی بلند ترین چوٹی ماونٹ ایورسٹ کے بیس کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

اس چھوٹی سی عمر میں اس کی عظیم کامیابی ان سب لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی مثال ہے جو خدا سے حالات کا شکوہ کرتے ہیں۔ اس معذوری کے ساتھ شاید ہی اس سے پہلے کسی نے سوچا ہو کہ ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔

آپ کے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ معصوم بچہ پندرہ سال کی عمر میں لوگوں میں خصوصی افراد کے لیے آگاہی پیدا کرنے والی مہم کو لیڈ کر رہا ہے۔ وہ اس عمر میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سنگلاخ اور برف پوش پہاڑوں پر اس لیے سفر کر رہا ہے کہ وہ اپنے خصوصی بھائیوں کے لیے کچھ چندہ اکٹھا کر سکے۔ مدد کا یہ جذبہ ضرور اُس کی تربیت کا حصہ ہوگا۔ لیکن کیا یہ کام عام لوگوں کو نہیں کرنا چاہئے؟ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اگر آج آپ خود عملی طور پر ضرورت مند لوگوں کی مدد کا سوچیں تو کتنے گھروں میں مسکراہٹیں بکھیر سکتے ہیں؟

''ایلی ریمر'' کا یہ عظیم جذبہ، اُس کی کامیابی، بلند ہمتی ساری دنیا کے ڈاون سینڈروم بچوں کے والدین کو یہ پیغام دیتا ہے۔ وہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ اُن کی معذوری کی وجہ سے

بھی مایوس نہ ہوں۔ آپ کی تربیت میں اگر ہمارے لیے حوصلہ اور امید ہے تو ہم ثابت کریں گے کہ ہمیں بھی سب کچھ ممکن کرنا آتا ہے۔

**"کامیابی کی راہ میں نئے راستے مشکل ضرور مگر بے حد پرکشش ہوتے ہیں"**

❁❁❁

# انجیلا بچیلر

## Angela Bachiller

سپین میں تاریخ رقم کرنے والی پہلی ''ڈاون سینڈروم'' سیاست دان

ایک اور کہانی ایسی ہی معذوری کے ساتھ جس کے بعد یقیناً بے شمار خصوصی بچوں کے والدین اپنے بچوں سے بھی کامیابی کی امید رکھیں گے اور ہرگز انہیں بوجھ محسوس نہیں کریں گے۔ وہ جو سوچتے تھے کہ آخر یہ پیدا کیوں ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے ''انجیلا'' کی زندگی سے خوبصورت جواب۔ اور جو سمجھتے ہیں کہ مشکلات انسان کو زندگی میں آگے نہیں بڑھنے دیتی اُن کے لیے بھی یہ کہانی واضح پیغام رکھتی ہے کہ جب زندگی میں نیت کچھ کرنے کی ہو تو ہر مشکل خود راستہ دے دیتی ہے۔

سپین کی تاریخ میں اپنا نام رقم کرنے والی ''انجیلا'' ''ڈاون سینڈروم'' معذوری کا شکار ہے۔ اس کے والدین نے اُسے تین سال کی عمر ہی سے سکول بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ کیوں

کہ وہ جانتے تھے کہ بچوں کے لیے تعلیم سے خوبصورت کوئی اور تحفہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ''انجیلا'' سپین میں پیدا ہوئی اور وہیں اُس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ انجیلا سپین میں حکمران جماعت پیپلز پارٹی کی کارکن ہیں۔ وہ دنیا کی پہلی 'ڈاون سینڈروم' لڑکی ہے جو باقاعدہ سیاست میں قدم رکھ کر سپین میں ایک شہری کونسلر منتخب ہوئیں۔ وہ دنیا کی پہلی خاتون ہیں جو اس معذوری کے ساتھ پبلک آفیسر بنی۔ جہاں اس جیسے اور اُس کی عمر کے لوگ ووٹ تک دینے سے محروم ہیں اس جگہ کونسلر کی نشست ''انجیلا'' کے لیے واقعی بہت بڑی کامیابی ہے۔

اور اس کامیابی کو سب سے زیادہ اس معذوری کا شکار بچوں کے والدین نے محسوس کیا۔ ''انجیلا'' سوشل ویلفیر میں ایڈمنسٹریٹو اسسٹنٹ کے طور پر بھی تین سال تک اپنی خدمات سرانجام دے چکی ہیں۔

سپین میں ان کی کامیابی پر بے شمار والدین کو امید ہے کہ خصوصی افراد کے لیے وہ بہت بڑی تبدیلی کی علامت کے طور پر سامنے آئیں گی۔ کیوں کہ اس وقت بے شمار ''ڈاون سینڈروم'' بچے ووٹ کے حق سے بھی محروم ہیں۔ ''انجیلا'' اس وقت دنیا بھر کے ''ڈاون سینڈروم'' بچوں کے والدین کے لیے بہت بڑی امید کی کرن ہیں۔ ان کی کامیابی کے بعد انہیں بھی اپنے بچوں کا مستقبل بہتر محسوس ہونے لگا ہے۔

''ڈاون سینڈروم'' کے ساتھ سیاست کی دنیا میں نہ صرف قدم رکھنا بلکہ کامیاب بھی ہو جانا یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور اس کامیابی کے پیچھے چھپی ہوئی محنت ''انجیلا'' اور اُس کے والدین ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن اُس کی یہ کامیابی چیخ چیخ کے دنیا کو کہہ رہی ہے کہ دنیا میں کوئی انسان بے مقصد نہیں ہے۔ اگر مواقع دیے جائیں کوئی بھی کسی پر بوجھ نہ بنے۔ ''انجیلا'' کی محنت پوری دنیا کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کوئی سیکھنا چاہے تو اس میں سیکھنے کو بہت کچھ ہے۔

''بے شک کچھ الگ کر دکھانے کا جذبہ بڑی کامیابی کی ضمانت ہے''

# پابلو پنیڈا
## Pablo Pineda

ڈاون سینڈروم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین مقرر "پابلو" کی زندگی کی کہانی۔

"ڈاون سینڈروم" کے ساتھ ایک اور کامیاب شخصیت جس نے نا صرف اعلیٰ تعلیم میں دنیا کو حیران کیا بلکہ اپنی پرفارمنس اور فکر انگیزی سے بھی ساری دنیا سے لوگوں کی توجہ کھینچی۔ اُن کا کہنا ہے کامیابی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ معمولی توقعات رکھنا ہے۔ پابلو "ڈاون سینڈروم" کے ساتھ یورپ کے پہلے گریجویٹ ہیں جو نہ صرف ایک مثالی استاد ہیں بلکہ ایک بہترین ایکٹر اور موٹی ویشنل مقرر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ آئیں دیکھتے ہیں کیسے "پابلو" نے دنیا کو حیران کیا ہوا ہے

اُن کی پیدائش 1974 میں سپین میں ہوئی۔ اُنہوں نے ایجوکیشن میں ڈپلومہ کیا اور سائیکالوجی میں گریجویشن کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ انہوں نے زندگی میں سیکھنے کی جستجو کو

سب سے بڑھ کر رکھا۔

''ڈاون سینڈروم'' ہوتے ہوئے 2009 میں ''سلور شیل'' ایوارڈ جیتا۔ اُنہوں نے اداکاری کی دنیا میں قدم رکھا تو بہت نام کمایا۔ وہ کافی سالوں تک فلم کی پروموشن میں اور ایجوکیشن میں کیپسٹی بلڈنگ پر لیکچر دیتے رہے۔ اُنہیں ''شیلڈ آف دی سٹی'' کا ایوارڈ دیا گیا۔ وہ بہترین اداکار کے ایوارڈ کے لیے منتخب ہوئے لیکن اُن کا جذبہ اور منزل ٹیچنگ ہی تھی۔ اُنہیں استاد کا پیشہ سب سے زیادہ پسند ہے اسی وجہ سے مصروف ترین زندگی کے باوجود سکول و کالجز میں جا کر لیکچر دینا جاری رکھے۔ اُنہوں نے ڈاون سینڈروم کی دنیا میں ایک اور تاریخ رقم کرتے ہوئے اپنی کتاب ''The challenge of learning'' لکھی جو 2013 میں شائع ہوئی۔

وہ آجکل سپین کی ایک بڑی فاونڈیشن ( Lo que de verdad importa) کے ساتھ منسلک ہیں اور مختلف عالمی کانفرنسز میں خصوصی افراد کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ وہ مسلسل دوسرے ملکوں کے سفر کرتے رہتے ہیں اور وہاں ''ڈاون سینڈروم'' لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، انہوں نے دنیا کی ''لیڈنگ پرسنالٹی'' کو دنیا کے سامنے لانے والی آرگنائزیشن ''ٹیڈ ٹاک'' میں جا کر اپنے ''آئیڈیاز'' پوری دنیا کے ساتھ شیئر کیے۔

بے شک ''پابلو'' کی کامیابیاں کروڑوں نارمل لوگوں سے زیادہ ہیں۔ اُن کی کہانی ہر انسان کو یہ سبق دیتی ہے کہ اگر بچوں میں حوصلہ پیدا کر دیا جائے تو وہ اپنی حالت پر نہیں، اپنی منزل کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ ''پابلو'' آج ایک کامیاب لکھاری، سپیکر، اور ایکٹر کی زندگی گزارر رہا ہے۔

**''اگر آپ پروان کی قوت پیدا کرلیں تو آسمان کی بلندیوں کو اپنا منتظر پائیں گے''**

❀❀❀

## لورین پوٹر
## Lauren Potter

ایک ایسی بچی جس نے اپنی معذوری کے ساتھ فلم اور ٹی وی کی دنیا میں نام بنایا

''ڈاون سینڈروم'' کا شکار یہ بچی 10 مئی 1990 کو امریکہ میں پیدا ہوئی۔ ایک ایسی معذوری جس کا لوگوں کی نظر میں کوئی مستقبل نہیں۔ ایک ایسی معذوری جس میں انسان کی ذہنی استعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ والدین کے لیے بہت بڑی پریشانی تو تھی لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے۔ لورین نے اپنے جیسے بچوں کی طرح بہت دیر سے چلنا شروع کیا۔

جب اس نے سکول جانا شروع کیا تو اُسے بہت سے منفی رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے ساتھی روزانہ اُس کی ذات پر طنز و تنقید کرتے۔ اُس کا خوب مذاق اُڑاتے۔ اُس کی شدید خواہش تھی کہ وہ نارمل نظر آئے اور عام لوگوں والی زندگی گزار سکے۔

حیران کن طور پر اُس نے اس معذوری کے ساتھ نہ صرف 10th گریڈ پاس کیا

بلکہ پولی ٹیکنک سے گریجویشن بھی مکمل کی۔ جو کہ اس معذوری کے ساتھ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ اپنی تعلیم کی وجہ سے بے شمار تنظیموں کا حصہ بن گئی۔

اُس نے 16 سال کی عمر میں فلم اور ڈرامہ انڈسٹری کا حصہ بن کر اپنی قابلیت اور کارکردگی سے کروڑوں لوگوں کو حیران کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے جاندار کردار کی وجہ سے نہ صرف بے شمار شہرت کمانے میں کامیاب ہوئی بلکہ انہوں نے فلم اور ٹی وی انڈسٹری سے خصوصی ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ ان کی سب سے طویل سیریل (Glee) تھی جو کہ 2009 سے 2015 تک چلتی رہی اور 56 اقساط پر مشتمل تھی۔

اُن کا کہنا ہے کہ ہماری مشکلات بھی دوسرے لوگوں جیسی ہی ہیں۔ ہم سکولوں میں طنز و تنقید سے تحفظ چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ہمیں بھی پارکس اور ایسی دوسری جگہوں پر خوش آمدید کہا جائے۔ ہمیں بھی اپنی جابز اور رہائش کی فکر ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ ہمیں بھی برابر کی عزت دی جائے۔

نومبر 2011 میں باراک اوبامہ نے لورین کو ذہنی معذور (Intellectual Disabilities) کا صدر بنایا۔ وہ وائٹ ہاؤس میں اس معذوری کی نمائندہ تھی۔ اُس نے اس معذوری کی بے شمار کمزوریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اُن کا کہنا ہے کہ ذہنی کمزور لوگوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونے چاہیں جو باقی لوگوں کو حاصل ہیں۔ وہ کہتی ہیں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں ایکٹریس بنوں گی۔ لیکن میں آج ایکٹریس ہوں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اس معذوری کے ساتھ صدارتی طور پر چنی جاؤں گی۔ لیکن مجھے منتخب کیا گیا۔ ممکنات کی کوئی انتہا نہیں ہے اگر سب کو ٹھیک سے ساتھ لے کر چلا جائے تب ہی ملک ترقی یافتہ کہلاتے ہیں۔

2015 کے سپیشل اولمپک مقابلوں میں انہوں نے ایمبیسڈر کا رول ادا کیا اور ایک اچھی سپیکر اور رول ماڈل کی حیثیت سے معذوری کی آگاہی مہم میں بھر پور کردار ادا کیا۔

2016 سے وہ پورے امریکہ میں خصوصی افراد کے حوالے سے آگاہی مہم کا حصہ بنی ہوئی ہیں اور مختلف جگہوں پر جا کر ایک بہترین مقرر کے طور پر خود کو منوا رہی ہیں۔ وہ آج پوری دنیا میں ''کامیاب اداکارہ''، ''وائٹ ہاؤس ایڈوائزر'' اور سوشل ایکٹیوسٹ ہیں۔ وہ پوری دنیا میں

موجود ''ڈاون سینڈروم'' بچوں اور ان کے والدین کے لیے امید کی کرن اور رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اپنی شدید سے شدید معذوری کے باوجود لورین پوٹر جیسے لوگ تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ وہ دنیا کی توقعات سے بالکل اُلٹ چل کر کامیابیاں سمیٹ رہے ہیں۔ اُنہیں چاہے کسی نے حوصلہ دیا ہو یا انہوں نے اپنے اندر حوصلہ پیدا کیا ہو دونوں صورتوں میں وہ اتنے خاص ضرور ہو گئے ہیں کہ آج اُن پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔

**''آپ لوگوں کا حوصلہ بن جائیں پوری کائنات آپ کا حوصلہ بن جائے گا''**

❁❁❁

# جیمی بریور

## Jamie Brewer

''ڈاون سینڈروم'' کے ساتھ فلم انڈسٹری کی پہچان بن جانے
والی لڑکی

''جیمی'' 5 فروری 1985 کو امریکہ میں پیدا ہوئی۔ اسے بچپن سے ہی میڈیا میں جانے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اُس نے کالج میں باقاعدہ اس کی کلاسز لے کر اس کو سیکھا۔ وہ ایک آڈیشن کے ذریعے باقاعدہ اس انڈسٹری میں داخل ہوئی اور اپنی شاندار ایکٹنگ کی بنا پر پوری دنیا میں شہرت حاصل کی۔ انہوں نے ٹی وی شوز، ہارر فلمز اور ڈراموں میں شاندار کارکردگی دکھائی۔

فروری 2015 میں دنیا کی پہلی ''ڈاون سینڈروم'' کا اعزاز حاصل کیا جس نے نیویارک فیشن ویک میں پرفارم کیا۔ وہ زندگی میں ملنے والے ان موقعوں پر انتہائی خوش ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ بہت بڑی بات ہے کہ فیشن انڈسٹری خصوصی افراد کو بھی اپنی کارکردگی دکھانے

کے مواقع دے رہی ہے۔ ان کا یقین ہے کہ جو کارکردگی نارمل لوگ دکھا سکتے ہیں ویسی ہی خصوصی افراد بھی دکھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

وہ اپنی کامیابی کے ساتھ اپنی کمیونٹی کے لیے بھی بہت محرک ہے۔ وہ پہلی کم عمر لڑکی تھی جنہیں اے آر سی بورڈ ( ARC Governmental Affairs Committee for the State of Texas) کے لیے باقاعدہ صدارتی طور پر چنا گیا۔ پھر وہ ٹیکساس میں ایگزیکٹیو بورڈ کی ممبر بنی۔ یہ وہ کمیٹی تھی جو حکومتی نمائندوں کے ساتھ مل کے خصوصی افراد کے حوالے سے پیش رفت میں کردار ادا کرتی تھی۔ جیمی کی کوششوں سے ایسے الفاظ کو ختم کیا گیا جو خصوصی افراد کی دل آزاری کا باعث بنتے تھے۔ وہ بے شمار تنظیموں کی محرک رکن ہیں اور خصوصی افراد کے لیے بے شمار خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ تھیٹر سے ایکٹنگ کا آغاز کرنے والی ''جیمی'' آج کامیاب ٹی وی، فلم ایکٹریس کے ساتھ دنیا کی پہلی ''ڈاون سینڈروم'' ماڈل کا اعزاز بھی اپنے پاس رکھتی ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو زندگی میں سب سے زیادہ طنز و تنقید کا شکار ہونے والے یہ بچے جن کا بچپن دوسرے بچوں کے لیے مذاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو اپنا مذاق بنا کر دوسروں کو تو ہنسنے دیتے ہیں لیکن اکیلے میں بیٹھ کر جانے کتنے آنسو بہاتے ہیں۔ جانے کتنی دفعہ وہ اندر ہی اندر مرتے ہیں۔ جنہیں حقیقت میں معاشرے کا اضافی جز سمجھا جاتا رہا ہے۔ وہی بچے اپنی انہی معذوریوں کے ساتھ جنگ کر کے دنیا میں اپنے وجود کو منوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس میں کامیاب ہو کر اپنے ساتھ دنیا بھر کے والدین کے لیے ایک امید اور روشنی بنے ہوئے ہیں۔

آیئے عہد کیجیے! کبھی کسی کو تحقیر کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ کبھی کسی کو یہ احساس نہیں دلائیں گے کہ اُس کا وجود آپ کے لیے مذاق ہے، بے وقعت ہے۔ اُس کی زندگی آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اپنی اولاد کی تربیت ایسے کیجیے کہ وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہ کر پائیں۔

''کسی کی پیروی کرنے کے بجائے ایسی نئی راہ پکڑیں کہ زمانہ آپ کی پیروی کرے''

❁❁❁

# میگن میکومیک

## Megan McCormick

''ڈاون سینڈروم'' کے ساتھ پہلی استاد کے مقام پر فائز ہونے والی میگن

''میگن'' 22 سال کی ایک ''ڈاون سینڈروم'' لڑکی ہے جو امریکہ میں پیدا ہوئی۔ اُس کے والدین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اس کی پیدائش پر وہ کچھ دن تو پریشان رہے لیکن بعد میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بچی کی بھی اپنے باقی بچوں کی طرح تربیت کریں گے۔ اور اُس کی تعلیم پر بھرپور توجہ دیں گے۔ وہ اپنا سب سے زیادہ وقت اپنی اسی بچی کو دیتے اور اس سے ڈھیروں باتیں کرتے۔

''میگن'' نے اپنی محنت سے وہ کچھ حاصل کیا جو اس معذوری کے ساتھ ناممکن نظر آتا ہے۔ اُس نے نہ صرف تعلیم میں اعلیٰ کارکردگی دکھائی بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں بشمول سپورٹس، جمناسٹک، تیراکی اور میوزک میں بھی اپنی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ آٹھ

سال کی عمر میں سپیشل اولمپک میں شامل ہونا شروع ہو چکی تھی۔ وہ عالمی مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے 2003 میں آئرلینڈ اور 2007 میں چین گئی۔

اُس نے ایک شمولیاتی سکول سسٹم میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ہمیشہ کلاس میں پہلے ڈسک پر بیٹھتی تاکہ بورڈ کو پڑھ سکے اور استاد کو پوری توجہ سے سن سکے۔ تعلیم سے محبت اور لگن نے اُسے بہت جلد کلاس کی بہترین طالبہ بنا دیا۔ وہ ریاضی اور سائنس میں سب سے زیادہ ایکسپرٹ ہو گئی۔ اُس نے یونیورسٹی پہنچ کر بھی انہی مضامین کا انتخاب کیا اور وہ آکوپیشنل تھراپسٹ بننا چاہتی تھی۔ اُس کا یونیورسٹی رزلٹ ناقابل یقین 92 فیصد نمبروں کے ساتھ تھا۔

لیکن پھر جب اُس نے ایک سکول میں انٹرن شپ کی تو اُسے تعلیم دینے سے محبت ہو گئی اور اُس نے استاد بننا بہتر سمجھا۔ اُسے تعلیم دے کر سب سے زیادہ خوشی ملتی اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اسی مقصد کے لیے دنیا میں آئی ہے۔

میگن 22 سال کی کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ ڈاون سینڈروم کے ساتھ اُس کی کامیابیاں دنیا کے لیے ایک بے مثال کامیابی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ایسے بچوں کے والدین ہرگز اپنی ہمت نہ ہاریں۔ ان کا بھرپور ساتھ دیں وہ آپ کی توقعات سے بڑھ کر پورا اتریں گے۔ آج وہ خصوصی بچوں کی رول ماڈل کی حیثیت سے سپیشل سکول میں اپنی خدمات دے رہی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر میگن جیسے بچے سارے مسائل کے باوجود معاشرے میں اپنا مقام پیدا کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ استاد کے مرتبہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔ تو کتنے ظالم ہیں وہ لوگ جو ایسے بچوں کے ذہن میں بار بار معذوری کا احساس دلا کر اُن کی امیدیں توڑ دیتے ہیں۔ اُن کی سوچ کو محدود کر دیتے ہیں۔ اگر وہ فقط اپنی سوچ بدل لیں تو ایسے لاکھوں بچوں کی زندگی بدل سکتی ہے۔

**"اگر آپ بڑے خواب دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو بڑے مسائل سے لڑنے کا حوصلہ بھی پیدا کریں"**

❁❁❁

# براین برگن

## Bryann Burgess

### کولمبیا میں تاریخ رقم کرنے والی ڈاون سینڈروم لڑکی

وہ 20 اگست 1988 کو کولمبیا میں ''ڈاون سینڈروم'' معذوری کے ساتھ پیدا ہوئی۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر 22 سال کی عمر تک اُس نے بے شمار مشکلات دیکھیں۔ وہ جسے سب اُس کے لیے ناممکن کہتے تھے اس نے ہمیشہ وہ کر کے دکھایا۔ وہ میوزک، تھیٹر اور تعلیم کو ایک ساتھ لے کر چلی وہ جانتی تھی کہ وہ میوزک اور اداکاری جیسے مضامین میں بہت آگے تک جا سکتی ہے لہٰذا اس نے انہی پر توجہ دی۔

اُس نے اپنی محنت اور لگن سے ثابت کیا کہ دنیا میں کچھ ایسا نہیں جسے حاصل نہ کیا جا سکتا ہو۔ تعلیم سے اُسے ایسی محبت ہوئی کہ اُس نے سب چھوڑ کا استاد بننا پسند کیا اور بالآخر اس مرتبہ پر پہنچنے والی کولمبیا کی پہلی ''ڈاون سینڈروم'' لڑکی بنی۔

استاد کے مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد اُس کا کہنا تھا کہ میں نے ہمیشہ سخت محنت کی

اور اچھے سے اچھا کر کے دکھانے کی کوشش کی۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ لوگ کیا سوچتے ہیں یا میرے لیے کیا رائے رکھتے ہیں۔ میں اگر کبھی گر بھی جاتی تو اُٹھ کر پھر نئے حوصلے سے چل پڑتی۔

بچپن سے وہ استاد بنا چاہتی تھی۔ یہ اُس کا خواب تھا جسے اُس نے اپنی محنت سے پورا کر کے دکھایا۔ اب وہ بھرپور جذبے سے خصوصی بچوں کو میوزک کی تعلیم دیتی ہیں۔ لیکن اُس کا سیکھنے کا عمل ہرگز نہیں رُکا۔ وہ اب بھی بھرپور محنت کر کے سیکھنے کی کوشش بھی جاری رکھے ہوئے ہے تاکہ اچھے سے اچھا سیکھا بھی سکے اور اسی تعلیم کے شعبے میں مزید آگے بھی جا سکے۔

قارئین! اپنے دل میں ذرا اُس جذبے کو محسوس کرنے کی کوشش کیجیے جو دوسروں کی خدمت پر خود کو معمور کرنا چاہتا ہے۔ جو اپنے خوابوں کو دوسروں کے ذہنوں میں پرونا چاہتا ہے۔ جس کو جب کوئی رول ماڈل نہیں ملتا تو وہ خود رول ماڈل بننا چاہتا ہے۔

یقین کریں یہ کامیابی فقط ''برائین'' کی نہیں ہے کہ وہ استاد بن گئی ہے۔ یہ کامیابی ہر اُس خصوصی بچے کی ہے جنہیں وہ تعلیم دے رہی ہے۔ جن کی وہ زندگیاں سنوار رہی ہے۔ اپنے جیسی استاد کو دیکھ کر وہ بھی خواب دیکھنے لگے ہوں گے اور یقیناً وہ بھی زندگی میں بہت کچھ کر کے دکھائیں گے کیوں کہ اُن کے سامنے امید موجود ہے۔ اُن کے سامنے ایک رول ماڈل موجود ہے۔

''جو مسائل دیتا ہے وہی وسائل بھی دیتا ہے آپ کو بس استعمال ہی تو سیکھنا ہے''

❁❁❁

# ٹم حارث
## Tim Harris

پہلا ''ڈاون سینڈروم'' ریسٹورنٹ کا مالک

والٹ ڈیزنی کا مشہور قول ہے کہ ''جو تم سوچ سکتے ہو وہ تم کر بھی سکتے ہو'' ٹم حارث کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ وہ 1986 میں ''ڈاون سینڈروم'' جیسی معذوری کے ساتھ امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس کی ساری زندگی امیدوں سے بہت بڑھ کر کارکردگی دکھاتی نظر آتی ہے۔ 13 سال کی عمر میں اس نے سپیشل اولمپک میں حصہ لینا شروع کر لیا تھا۔ اُس نے درجنوں کے حساب سے گولڈ میڈل جیتے۔

اس کے ساتھ اُس نے بڑی کامیابی سے سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی کا سفر طے کیا اور 2008 میں ''فوڈ سروسز'' میں اپنی گریجویشن مکمل کی۔ اُس نے بہترین طالب علم ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

وہ جب 14 سال کا تھا تب سے اُس نے آنکھوں میں ایک خواب سجا رکھا تھا کہ وہ

اپنا ریستوران بنائے گا۔ اور اُس کا یہ خواب 2010 میں پورا ہوا جب اُس نے ''ٹم پلیس (Tim's Place)'' کے نام سے باقاعدہ اپنے ریسٹورنٹ کا آغاز کیا۔ وہ اپنے اس بزنس کے خواب کے پورا ہونے پر بہت خوش ہے اور اپنے ریسٹورنٹ میں آنے والے تمام لوگوں کو بھرپور عزت اور مسکراہٹوں سے نوازتا ہے۔ وہ صبح جلدی اُٹھ کر 7 بجے تک اپنا ریستوران کھول لیتا ہے۔ اُسے اپنے اس کام سے شدید محبت ہے۔ آج وہ ''ڈاون سینڈروم'' لڑکا ایک کامیاب بزنس مین ہے۔

اُس کے ریسٹورنٹ کی خاص بات یہ ہے کہ وہاں آ کر کسٹمر باقی مینیو کے ساتھ ''ٹم'' سے گلے ملنے کی خواہش کا باقاعدہ آرڈر کرتے ہیں۔ ''ٹم'' ان سب سے گلے ملتا ہے اور ابتک وہ 38 ممالک کے ساٹھ ہزار سے زائد لوگوں کو اپنے ریسٹورنٹ میں گلے مل چکا ہے۔ اور اسکا سب سے یادگار لمحہ وہ تھا جب وہ کھانے پر باراک اوبامہ سے گلے ملا۔

اُس نے خصوصی افراد کے لیے ''ٹمز بگ ہارٹ فاونڈیشن'' بنا رکھی ہے اور وہ مختلف اداروں میں جا کر موٹی ویشنل لیکچر بھی دیتا ہے۔ 2013 میں اُسے اُس کی خدمات کے عوض ''گلوبل ڈاون سینڈروم فیڈریشن'' کی جانب سے ایڈووکیسی ایوارڈ دیا گیا۔

کیسی خوبصورت کہانی ہے ایسی معذوری کے ساتھ ایک بزنس مین بننے کی۔ ''ٹم'' حقیقتاً تمام ''ڈاون سینڈروم'' کے لیے ایک رول ماڈل کی حثییت رکھتا ہے۔ اُس نے اپنا خواب پورا کر کے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں ہر کام ممکن ہے۔ لہٰذا اگر آپ خواب دیکھ سکتے ہیں تو پورے بھی کر سکتے ہیں۔ بس آپ نے کبھی حوصلہ نہیں چھوڑنا۔ امید کا دامن ہمیشہ پکڑ کے رکھنا ہے۔

**''آپ محبتیں تقسیم کرنے والے بن جائیں آپ کے گرد ایسا میلہ لگے گا کہ محبتیں سمیٹنا مشکل ہو جائے گا''**

❁❁❁

# مریم خان

## Maryam Khan

**پاکستان کی پہلی ''ڈاون سینڈروم'' بچی جس نے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا نام روشن کیا**

معذوری کے شعبے سے منسلک لوگ جانتے ہیں ''ڈاون سینڈروم'' یا منگول بچوں کا مستقبل سب سے زیادہ غیر محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثریت لوگوں کو ہنستے ہنساتے یا تنگ کرتے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے کسی چیز پر زیادہ دیر توجہ مرکوز رکھنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ آپ کو بہت کم کامیابی کی کہانیاں ان بچوں سے متعلق ملیں گے۔ لیکن خدا کی ذات آج بھی زندہ مثالوں سے یہ ثابت کرتی ہے کہ کوئی وجود بے وجہ نہیں ہے۔ اگر کوئی خود نہ سمجھ ہو بھی تو سوسائٹی یا خاندان اگر بھرپور کردار ادا کرے تو یہ بچے بھی کامیاب زندگی گزار کے دیکھا سکتے ہیں۔

پاکستان کی ''مریم خان'' بھی ایک ایسا ہی نام ہے جو آج ایک نامور آرٹسٹ ہیں۔

جبکہ ڈاکٹروں نے پیدائش کے بعد مریم کو ڈاؤن سنڈروم یا منگول بچہ قرار دیا۔ ان کے والدین کے لیے یہ خبر کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ لیکن ماں کے جذبے کے آگے اور اُس کی محنت اور محبت کے آگے بڑی بڑی ناممکن چیزیں ممکن کا روپ دھار لیتی ہیں۔ مریم کی والدہ نے اس کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور اپنی بیٹی کی پرورش اور تربیت میں دن رات ایک کر دیا۔

انہوں نے مریم کو گھر سے سکھانا شروع کیا اور اس کو بھرپور توجہ دی اور ہر کام میں اس کی رہنمائی کرنا شروع کر دیا۔ جب مریم تھوڑی بڑی ہوئی تو وہ صرف تیس الفاظ بول سکتی تھی۔ دنیا میں ذہانت کی اقسام ہیں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ریاضی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتے تو دوسرے شعبوں میں چلے جاتے۔ کچھ کو سائنس سمجھ نہیں آتی تو آرٹ کی طرف چلے جاتے۔ وہاں کوئی کسی کو معذور نہیں سمجھتا کیوں کہ یہ سب اپنی اپنی ذہانت پر منحصر ہوتا ہے۔ مریم کے والدین نے اسی بات کو سمجھا اور اُس کی ذہانت تلاش کی تو معلوم ہوا کہ وہ آرٹ اور ڈیزائن میں دلچسپی رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کی ساری توجہ کتابوں سے ہٹا کر آرٹ کی طرف کر دی گئی۔

اس طرح سے مریم نے آرٹ کو اپنا ذریعہ پیغام بنایا۔ آرٹ کے ذریعے مریم بہت سی زبانیں بولنے لگی اور اپنی قابلیت دوسروں تک پہنچانے لگی۔ مریم خان کی تصویروں کی پہلی باقاعدہ نمائش 2002ء میں کراچی شیرٹن ہوٹل میں منعقد ہوئی جس میں پچاس سے زائد پینٹنگز نمائش کے لیے رکھی گئیں تھیں۔ مریم پاکستان کی پہلی ڈاؤن سنڈروم بچی تھی جس نے بین الاقوامی کمپنی ”نوہ نارڈسک“ کے لیے ”کلر تھیم“ پینٹ کیا۔ پاکستان سے باہر مریم خان جرمنی، اٹلی اور امریکہ میں بھی اپنی بنائی گئی تصویروں کی نمائش کر چکی ہیں۔ اس طرح درست تشخیص اور درست سمت نے مریم خان کی معذوری کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اگر اسی طرح سب والدین بچوں کی ذہانت کو ڈھونڈ کر صرف اس کی سمت درست کر دیں تو ہر بچہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہر بچہ بے مثل ہے۔ یہ والدین اور اساتذہ کی معذوری ہے جو اُن کی صلاحیتیں پہچاننے سے قاصر ہے۔ ان بچوں کو نکھارنے اور ان کی صلاحیتیں سامنے لانے کے لیے بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اس طرح ہر بچہ مریم خان کی طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔

”ڈاون سینڈروم“ سے جڑی ہر کامیابی کی کہانی آپ کو بتا رہی ہے کہ معذوری کا تعلق ناکامی سے ہرگز نہیں ہے۔ دنیا کا ہر انسان ایک کامیاب اور خوشگوار زندگی گزار سکتا ہے۔

اور ہر عام انسان کے لیے یہ چیلنج ہے کہ جب یہ بچے اتنی مشکلوں کے بعد اتنا کچھ حاصل کر سکتے ہیں تو آپ کیوں بے خواب جی رہے ہیں۔ خدارا خود کو محدود سوچ اور محدود خوابوں سے باہر نکالیے۔ زندگی میں بہت بڑے کام آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ آگے بڑھیے اور اپنا نام تاریخ میں رقم کرا کے امر ہو جائیے۔ میرے اللہ کا فرمان ہے کہ:

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو (سورۃ زمر 53)

❁❁❁

آیئے مایوسیوں کو ختم کر کے اس وطن کے لیے کچھ کرنے کا عہد کریں۔ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیاں بدلنے کا عہد۔ مسلسل آگے بڑھنے اور کبھی حوصلہ نہ ہارنے کا عہد۔ کیوں کہ ہمارے پاکستان کے خصوصی افراد اگر وطن کے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں تو آپ کا تھک کے ہار مان لینا، بہت تھوڑے پر راضی ہو جانا واقعی زیادتی ہے۔ اگر پاکستان میں لوگوں کی معذوریوں کے ساتھ شاندار کامیابیاں دیکھیں تو آپ کو مزید بے شمار لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ہر ناممکن سفر کو ممکن کر دکھایا۔ یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جس کی نابینا کرکٹ ٹیم دنیا میں دو دفعہ ورلڈ کپ جیتنے کا اعزاز اپنے پاس رکھتی ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں ''شاکر شجاع آبادی'' جیسا عظیم شاعر رہتا ہے۔ جو پچھلے کئی سالوں سے بولنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہونے کے باوجود اتنی خوبصورت شاعری کرتا ہے کہ ہر شعر کے ساتھ لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں۔ شعر و شاعری کے چوبیس برسوں کے دوران انہوں نے ہزاروں دوہڑے، قطعے، گیت اور غزلیں لکھیں۔ جو بے شمار کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ 2007ء میں انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس کے اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ مسلسل اپنی بیماری اور غربت سے لڑ رہا ہے لیکن اپنی شاعری کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ بے شک شاکر جیسے عظیم شاعر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں ''تاب عرفانی'' جیسا نابینا شاعر اور ادیب پیدا ہوا۔ معذوری کو مجبوری بنانے کے بجائے اپنے شعور اور آواز کا جادو جگایا، نا صرف قیام پاکستان

کے بعد ریڈیو پر اپنی مقبولیت کا لوہا منوایا بلکہ پاکستان نابینا کرکٹ ٹیم کی بنیاد ڈالی۔ اور کئی ممالک میں جا کر کرکٹ کھیلی۔ بصارت سے محرومی کے باوجود پانچ شعری مجموعوں اور ایک خود نوشت سوانح کے مصنف ہیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں واہ کینٹ جیسے چھوٹے سے شہر میں ''شہزاد احمد'' پیدا ہوتا ہے۔ دو سال کی عمر میں معذوری کا شکار ہوتا ہے اور اس کے باوجود مختلف کام کر کے اپنی مدد آپ کے تحت ماسٹرز کرتا ہے اور آج ایک سسٹم انجینیر کی حیثیت سے اسلام آباد میں اپنی قابلیت کا لوہا منوا رہا ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں سکردو کے پہاڑوں سے اٹھ کر ''خادم حسین'' اپنی معذور ٹانگوں کے ساتھ سنگلاخ پہاڑوں میں روزانہ تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے سکول سے میٹرک کرتا ہے۔ اور 4 سال ہاسٹل میں مقیم رہ کر گریجویشن کر کے اپنے گاوں کا رخ کرتا ہے جس کے فقط 6 لڑکے تعلیم کے لیے سکول جاتے ہیں۔ وہ ہر گھر میں جاتا ہے اور بچوں کو تعلیم دلوانے کی درخواست کرتا ہے۔ گاوں کے تمام لڑکوں کو اکٹھا کرتا ہے اور اپنے گھر سے ان کی تعلیم کا آغاز کرتا ہے۔ اور یہ معذور لڑکا نہ صرف تمام لڑکوں کی تعلیم حاصل کرنے کا باعث بنا ہے بلکہ پورے گاوں کی لڑکیاں بھی اسی کی وجہ سے علم سے روشناس ہوتی ہیں۔ آج خادم حسین کی انتھک کوششوں کی وجہ سے اس کا گاوں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا مسکن ہے اور یہاں ہر سہولت میسر ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں ''نور الدین بھامانی'' جیسے زندہ دل لوگ کراچی میں رہ کر دنیا کی خدمت کر رہے ہیں۔ وہ شخص جو خود 10 سال سے بستر سے اترنے سے بھی معذور ہیں اور 22 سال سے مسلسل شدید بیماری کا شکار ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے سوشل ورکر کی باقاعدہ ٹیم بنا رکھی ہے جو پورے شہر میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ وہ سالوں سے بستر سے لگنے کے باوجود مسلسل اس ملک کی اور اس ملک کے لوگوں کی خدمت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ایسے جذبے فقط آپ سے دعاوں کا تقاضہ کرتے ہیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں ''ڈاکٹر فاطمہ شاہ'' جیسی عظیم بیٹیاں رہتی رہیں۔ انہوں نے نابینا ہونے کے باوجود ''ڈس ایبلڈ فیڈریشن آف پاکستان'' کی بنیاد رکھی اور اس کو

''ڈی پی آئی'' سے متعارف کروایا اور خود ورلڈ کونسل ممبر کے طور پر منتخب ہوئیں۔ انہوں نے ''ورلڈ بلائینڈ یونین'' کی بنیاد رکھنے میں بھی اہم کردار کیا اور ''فیڈرل کونسل نیشنل پارلیمنٹ'' کی رکن ممبر منتخب ہوئیں۔ اس عظیم خاتون کو ان کی خدمات کے عوض بے شمار بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ حکومت پاکستان نے اُن کو بہترین سماجی کام سرانجام دینے کے اعتراف میں ''تمغۂ امتیاز'' سے نوازا، وہ 12 اکتوبر 2002ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں لیہ کا ''ڈاکٹر دلشاد رشید'' انتہائی غربت کے باوجود اعلیٰ تعلیم کا فیصلہ کرتا ہے اور اس راستے میں آنے والی ہر مشکل تنگی اور بھوک کا جوان مردی سے مقابلہ کرتا ہے۔ دربار کے کھانے سے پیٹ کی آگ بجھانے والا ڈاکٹر مشکل ترین دنوں سے نکل کر آج نہ صرف ایک کامیاب زندگی گزار رہا ہے بلکہ غریب طلباء کی مالی معاونت کر کے اپنے گزرے ہوئے حالات کا ازالہ شکر گزاری سے کر رہا ہے۔ آج وہ لاہور کی معروف یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہے۔ بے شک ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں ٹانگوں سے مکمل معذور شجاع آباد کا ''محمد جواد بھٹی'' رینگ رینگ کر تعلیم کی منازل طے کرتا ہے اور اپنی دن رات کی محنت اور لگن سے میڈیکل میں جانے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن اُسے یہ کہہ کر انکار کر دیا جاتا ہے کہ وہ کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہے اس لیے علاج نہیں کر سکتا اور داخلہ نہیں دیا جاتا۔ وہ واپس جاتا ہے اپنی ساری زمین فروخت کر کے اپنی ٹانگوں کے چھ آپریشن کرواتا ہے۔ تقریباً سات ماہ ہسپتال کے بیڈ پر رہ کر تیاری کرتا ہے اور بالآخر بیساکھیوں کے ذریعے کھڑا ہونے کا قابل ہو جاتا ہے۔ اگلے سال پھر امتحان دے کر میڈیکل کی سیٹ اپنے نام کرتا ہے اور علامہ اقبال میڈیکل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اپنی تعلیم کو غربت کی انتہائی لکیر پر رہ کر پورا کرنے والا یہ ڈاکٹر آج اپنے وطن کے غریبوں کی بھرپور خدمت کر رہا ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں صوابی سے تعلق رکھنے والا ''عبدالرشید خان'' مسلسل سات سال تک پانچ کلاسوں کو اکیلا وہیل چیئر پر بیٹھ کر کنٹرول کرتا ہے اور وزیراعظم پاکستان سے بہترین استاد کا ایوارڈ حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ عظیم شخص ہے جو خود معذوری کے باوجود خصوصی افراد کو وہیل چیئر اور مصنوعی اعضا مہیا کروانے کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں کاموکی کی "رضیہ" شدید معذوری کے باوجود اپنے پورے گھر کی کفالت کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ اُس کی معذوری نے اُسے بستر تک محدود کر رکھا ہے اُس کے باوجود وہ سلائی کر کے نہ صرف اپنا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے بلکہ اپنے خاندان کا بھی سہارہ ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں نوابشاہ کے "عابد لاشاری" دونوں ہاتھوں سے معذور ہونے کے باوجود ایک بہترین استاد کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے سوشل ورک کے باعث پورے پاکستان میں جانے جاتے ہیں۔ وہ بیرون ممالک بھی پاکستان کی نمائندگی سرانجام دے چکے ہیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں سیسرآزاد کشمیر کی "نسرین عزیز" اپنے گاوں کی پہلی گریجویٹ لڑکی ہے۔ جو وہیل چیر پر بیٹھ کر نہ صرف بچوں کو تعلیم دے رہی ہیں بلکہ گذشتہ کئی سالوں سے خصوصی افراد کے حقوق کی جنگ بھی لڑ رہی ہیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں "افتخار احمد" صوابی کے ایک دور دراز گاوں میں انتہائی غریب گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی معذوری کی وجہ سے پیدائش پر پورا گاوں اسے دیکھنے آتا ہے۔ وہ لڑکا جسے سارا گاوں آدھا لڑکا یا عجوبہ سمجھتا تھا لوگوں کے کندھوں پر بیٹھ کر سیکنڈری سکول پاس کرتا ہے۔ سکاوٹس میں شامل ہو کر گورنر سرحد سے "قائد اعظم بیج" لگواتا ہے۔ اپنی تعلیم کے خواب کو پورا کرنے کے لیے روزانہ بیس کلومیٹر دور کالج جاتا ہے۔ پشاور رہ کر پی ٹی سی پاس کرتا ہے۔ اور یہ لڑکا جسے گاوں، سکول، کالج، یونیورسٹی کے لڑکے عجوبہ اور آدھا لڑکا کہہ کر مذاق کرتے تھے نہ صرف استاد بنتا ہے بلکہ اپنی کارکردگی کی بنا پر سال کا بہترین ٹیچر قرار پاتا ہے اور اپنی انتھک محنت کے بل بوتے پر "تمغہ امتیاز" حاصل کرتا ہے۔ آج یہ استاد اپنے پورے خاندان کی کفالت کا ذریعہ ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں گجرات کے "رشید سبحانی" معذوری کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ عظیم انسان گزشتہ بائیس سال سے "ڈیسنٹ ہوم" کے نام سے ایک سکول چلا رہے ہیں، جس میں یہ دس روپے فیس لیتے ہیں۔ اور بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں۔ اور اس سکول کی اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ کئی سال تک شام کے وقت کام کرتے۔

گذشتہ دس سالوں سے یہ گورنمنٹ میں سینیئر استاد ہیں اور ان کی بیگم وہ سکول سنبھال رہی ہیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں واہ کینٹ کی ''اسماء ناہید'' معذوری کی باوجود نہ صرف اچھی پینٹر ہیں بلکہ ڈبل ماسٹرز کر کے آج کامیابی سے اپنا سکول چلا رہی ہیں۔ اور بچوں کے ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کر رہی ہیں۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں ہری پور کا ''ثاقب علی'' بغیر بازوں کے اپنے پاوں سے لکھ کر گریجویشن تک تعلیم حاصل کر کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ڈپلومہ بھی حاصل کرتا ہے اور پاوں کی مدد سے نارمل افراد کی طرح کمپیوٹر کا استعمال کرتا ہے۔ آج بھی محنت پر ایمان رکھتے ہوئے کامیابی کے راستے پر گامزن ہے۔

یہ ہمارا پاکستان ہے جہاں لاہور کا ''شفیق الرحمان'' خود پولیو کا شکار ہونے کے باجود ایک تنظیم (Milestone) بناتا ہے۔ پورے پاکستان میں خصوصی افراد کی نمائندگی کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں جا کر خصوصی افراد کی رہنمائی اور ٹریننگ کا کام سرانجام دیتا ہے۔

یہ ہمارا ہی پاکستان ہے جہاں ''ایاز خان''، ''راحیل شیریں''، ''ضیا نور'' جیسے عظیم لوگ اپنی معذوری کو بھول کر پچھلے 10 سال سے مسلسل خصوصی افراد کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اُن کے لیے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں اور اُن کے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مقصد کو پہچانا۔ اپنی کسی خامی کو رونا رونے کے بجائے اپنی خوبیوں کو نکھارا اپنے شکر کو قائم رکھا اور اپنی زندگی کے مقصد کو رائیگاں نہیں جانے دیا۔ بے شک اللہ کریم کا فرمان ہے:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا

سو کیا تم نے یہ خیال کر لیا تھا کہ ہم نے تمہیں بے کار (و بے مقصد) پیدا کیا ہے (سورۃ المؤمنون-115)

بے شک خدا کی ذات نے ہر انسان کو کوئی مقصد دے کر ہی بھیجا ہے یہ الگ بات ہے کی انسان اپنی کم علمی اور مایوسی کو خود پر سوار کر کہ پوری زندگی گلے شکووں میں گزار دیتا ہے۔ بات سمجھنے کی ہے اُس ذات نے تو سب کو مکمل بنایا ہے یہ ہماری اپنی معذوری ہے ہم اپنی یا کسی

بھی اور کی خوبیوں کو دیکھنے کے بجائے خامیاں دیکھنے میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

یاد رکھیے! زندگی میں کسی بھی معذوری کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ محروم ہیں اور ساری زندگی محروم رہیں گے۔ کسی بھی انسان میں جسمانی کمی کچھ مسائل میں اضافہ ضرور کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کو زندگی میں کچھ بڑا کرنے اور آگے بڑھنے سے روک سکتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں بڑا واضح پیغام ہے:

وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۠ ۝۲۱۶

ہوسکتا ہے کہ تم ناپسند کرو ایک چیز حالانکہ وہ بہتر ہو تمہارے لیے اور ہوسکتا ہے کہ تم پسند کرو ایک چیز حالانکہ وہ بری ہو تمہارے لیے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (سورۃ البقرہ آیت 216)

دنیا میں اگر کسی حقیقی معذوری کا وجود ہے تو وہ ایک ہی ہے۔ جو انسان کو ترقی کرنے، آگے بڑھنے، کچھ بھی بڑا کر دکھانے سے روک سکتی ہے۔ وہ معذوری انسان کی کاہلی اور سستی ہے۔ جس کا شکار دنیا کے اربوں لوگ ہیں۔ اور وہ کولہو کے بیل والی زندگی جی رہے ہیں۔ جو ساری زندگی ایک ہی جگہ گھوم کر زندگی گزار دیتا ہے اور اپنا پیٹ بھر کے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بہت کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔ سست اور کاہل ہونا ایسی معذوری ہیں جن میں انسان کو اگر سب کچھ میسر بھی ہو تو وہ اُسے استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

آپ ذرا تصور کیجیے ایسے انسان کا جس کا تمام جسم سلامت ہے جس کی آنکھیں، کان، ناک، چھونے کی حس، اور دماغ اپنی بہترین حالت میں ہیں لیکن وہ انسان ان سے بھرپور کام لینا نہیں جانتا۔ یہ اُس کی کاہلی ہی ہے جو اُسے ان سے بھرپور کام لینے نہیں دے رہی۔ یقین مانیں حقیقی معذوری اسی چیز کا نام ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ جو بھی انسان ایک بے مقصد زندگی گزار رہا ہے وہ خود کو معذور سمجھے یا نہ سمجھے دنیا کے لیے وہ معذور ہی ہے۔

اس کتاب میں دنیا بھر سے ہر معذوری کے ساتھ مثالیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ وہ چاہے سننے دیکھنے اور بولنے سے معذور ہیلن کیلر ہو، اپنی پلکوں کی جنبش کے ذریعے فلسفے اور سائنس کی دنیا میں انقلاب لانے والا سٹیفن ہاکنگ ہو، اپنی معذور ٹانگوں کے ساتھ

ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والی اروما سنہا ہو، اپنی نابینا آنکھوں سے ساری دنیا کے نابینا لوگوں کو بریل کا خوبصورت تحفہ دینے والا لوئیس بریل ہو، بغیر ٹانگوں بازوؤں کے فقط دھڑ ہی کا مالک نک وجلک کی زندہ دل ہستی ہو، اپنے آنکھوں میں اندھیرے لے کر پیدا ہونے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر صابر، ڈاکٹر فرزانہ، ڈاکٹر عزیزہ ڈاکٹر شاہدہ رسول اور ڈاکٹر طہٰ حسین ہوں۔ سب کی زندگیاں اربوں کامیاب ترین لوگوں سے زیادہ کامیاب ہیں۔ کیا آپ انہیں معذور سمجھتے ہیں؟

آپ سائنس کی دنیا میں افق پر چمکتے ستارے البرٹ آئن سٹائن اور آئیزک نیوٹن کے قانون دیکھیں، یا کہ پھر تھامس ایڈیسن کے وہ تحقیق و ایجادات جنہوں نے دنیا کو ترقی اور ٹیکنالوجی کا اعلیٰ شہکار بنا ڈالا ہے۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں سے اپنے بچپن کے معذوری کے لیبل کو اتار پھینکنے میں کامیاب رہے۔ آپ دنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں آپ کو بے شمار ادھورے جسم ملیں گے جن کو لوگوں نے معذور کہا لیکن حقیقت میں وہ حقیقی معذوری کا شکار نہیں تھے۔ وہ سستی، کاہلی اور آرام پسندی سے بہت دور تھے۔ یہ سب بشمول جان ملٹن، جارج واشنگٹن، گراہم بیل، کرسٹوفر دیوبر، رابن ولیم، لیوڈوان، لارڈ برائن، لارڈ نیلسن، اوران جیسے بیشمار نام ثابت کر چکے ہیں کہ وہ معذور کہلانے کے باوجود معذور بن کر نہیں رہے۔ انہوں نے اپنی محنت اور زندگی کے حقیقی مقصد کو پورا کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ اکیلے کروڑوں مکمل وجود رکھنے والوں سے کہیں زیادہ مکمل تھے۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں انہی معذور اور نامکمل کہلائے جانے والے لوگوں نے صحت مند اور مکمل انسانوں کے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ وہ الفاظ میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔

ہر کہانی ثابت کرتی ہے کہ فقط خواب ہی منزلوں پر پہنچنے کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ اکثر لوگ عمر بھر سو کر فقط خواب ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ خواب جاگتی آنکھوں کے درکار ہیں۔ آپ کا مقصد جتنا عظیم ہے آپکا اُتنا ہی حوصلہ مند ہونا ضروری ہے۔ آپ کو بڑی بڑی منزلوں کے لیے بڑی واضح چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان میں سب سے اہم واضح مقصد واضح سمت اور مستقل مزاجی ہیں۔ مقصد کا تعین آپ نے فقط ایک دفعہ کرنا ہے لیکن مستقل مزاجی ہمیشہ کے لیے آپ کی ہمسفر ہے۔ اس کو قائم رکھنے کے لیے آپکی مثبت سوچ بلند ہمتی

درکار ہیں۔ان خوبیوں کے ساتھ آپ جتنے اچھے ٹائم منیجر ہوں گے آپ کی رفتار منزل کی جانب اور منزل کی آپکی جانب اُتنی ہی تیز ہوگی۔

یہ جو آپ بہت سے کام کل کے لیے چھوڑ دیتے ہیں یہی آپ کی خود سے دشمنی ہے۔یہی سستی اور کاہلی آپ کی حقیقی معذوری ہے۔یقین مانیں آپ کی تعلیم عمل کے بغیر بوجھ ہے۔آپ کو اگر سچائی پسند ہے تو اس کی توقع فقط دوسروں سے نہ رکھیں۔اپنی ذات کی گہرائی تک اسے اپلائی کریں۔آنے والا کل فقط فریب ہے۔دھوکا ہے۔آپ کے پاس جو موجود ہے وہ صرف آج ہی ہے۔یہی آج ہے جس میں آپ کے لیے نیکی کے لیے۔عمل کے لیے، خوشیاں اور علم کے لیے۔مسکراہٹیں بکھیرنے کے لئے اور ہر لمحہ بھرپور گزارنے کے لیے وقت ہے۔صرف آج۔۔۔۔کل کی امید پر رہنے والے کروڑوں آئے اور بے شمار ادھوری خواہشات،ادھورے خواب اور ادھوری تمنائیں لے کر چلے گئے۔جس کو آج میں جینا نہیں آتا وہ کبھی کل میں جینا بھی نہیں سیکھ سکتا۔

آپ کو اگر زندگی میں آگے بڑھنا ہے تو ہر دن ہر لمحہ کا احتساب کریں۔اپنے ساتھ ہی مخلص ہو جائیں۔ہر رات سونے سے قبل آج کا احتساب کہ آج کیا نیا سیکھا، کتنے علم پر عمل کر کے دکھایا۔ہر اچھے دن کے اختتام پر خود کو شاباش دیں اور چند لمحے پھر آنے والی صبح کو دیں۔اور اگلے دن کی پلاننگ کریں کہ اُسے کیسے بھرپور کام میں لانا ہے۔کیسے یہ ملے ہوئے وقت کی نعمت کے ہر لمحے کو استعمال میں لانا ہے۔روز خود سے سوال کریں۔

میں اپنے مقاصد کے لیے کس قدر محنت کر رہا ہوں؟اور کامیابی کے لیے مجھے کتنی رفتار درکار ہے؟زندگی جینا اور زندگی گزارنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔زندگی گزارنے والے بہت زیادہ ہیں۔جب کہ جی کے دکھانے والے بہت کم!

فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ گزارا کرنا ہے یا جی کے دکھانا ہے۔آپ کو دنیا میں کھانے پینے اور مر جانے کے لیے بھیجا گیا ہے یا پھر کچھ کر دکھانے اور ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے کے لیے۔کیا آپ نہیں چاہتے آپ کتابوں میں نصابوں میں اور دنیا کے دلوں میں یادگار رہیں۔کیا یہ ناممکن ہے؟اگر یہ لفظ ناممکن آپ کی زندگی میں موجود ہے تو آپ زندگی گزارنے والے ہیں اور اگر آپ کر دو ممکن کے فارمولے پر عمل پیرا ہیں تو آپ جینا جانتے ہیں اور بے شمار لوگوں کو جینا

سیکھا سکتے ہیں۔

منزل آپ سے فقط "عملی قدم" کی دوری پر ہے۔ جس دن عملی قدم مستقل مزاجی کی شکل اختیار کر گیا جس دن آپ سوچوں کے بھنور سے نکل کر عملی دنیا میں آ گئے اس دن منزلیں خود آپ کے تعاقب میں لگ جائیں گی۔ اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں جس دن آپ نے عمل کو حقیقی معنوں میں اپنا کر اپنی واضح منزل کی جانب قدم بڑھا دیے زندگی خوبصورت ہو جائے گی۔ ہر روز منزل سے قربت کا احساس آپ کے حوصلے مزید بلند کرے گا۔ بے شک عمل کا ہر قدم منزل کو قریب سے قریب تر کرتا ہے بس سمت کا تعین واضح ہونا چاہیے۔ پھر آپ چلتے پانی کی مانند اپنا راستہ خود بناتے چلے جائیں گے۔ پھر آپ کا ہر لمحہ اپنی منزل کے لیے صرف ہو گا۔ کیوں کہ آپ خود کو پہچان چکے ہیں۔ اور اپنی پہچان ہی حقیقی پہچان ہوتی ہے۔ آپ اگر پوری دنیا کو پرکھنے کا تجربہ رکھتے ہیں اور آپ نے ابھی تک اپنی عظیم زندگی کے مقصد کو پہچانا ہی نہیں تو آپ کا تجربہ کس کام کا۔ جب تک آپ اپنے وجود کا مقصد نہ پہچان لیں آپ جینا سیکھ ہی نہیں سکتے۔ اور اگر جینا نہ آتا ہو تو زندگی کس کام کی۔ آپ کو تو پھر کسی کے دکھ بانٹنے کا درد سمیٹنے کا ہنر ہی نہیں آ سکتا۔ آپ کے تو اپنے ہی دکھ لامحدود ہوں گے اور گزارے والی زندگی سے بڑا دکھ اور کیا ہو گا۔ بلاشبہ بے عملی رکے ہوئے پانی کی طرح انسان کو بھی باسی کر دیتی ہے۔ وہ سستی کاہلی اور بوجھ زدہ زندگی کی ایک مثال ہوتا ہے۔

اپنی صلاحیتوں کو پہچانیں بے شک آپ کی آدھی کامیابی اسی میں پوشیدہ ہے۔ بڑی منزلیں ہمیشہ اُنہیں کا مقدر بنی، غیر معمولی کامیابیاں ہمیشہ وہی حاصل کر سکے جو اپنی صلاحیت کو پہچان گے۔ جنہوں نے اپنی ذہانت کے مطابق کسی شعبے کا انتخاب کیا۔ یاد رکھیں جب آپ اپنی صلاحیت والے شعبے میں چلے جاتے ہیں تو مستقل مزاجی خود بخود آ جاتی ہے۔ پھر اس کام میں آپ وقت کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ محنت آپ کو بور نہیں کرتی۔ آپ کو اپنے کام میں مزہ آنے لگتا ہے۔ حقیقت میں آپ کو کام، کام لگتا ہی نہیں۔

اللہ پاک نے پرندوں کو اڑنے کی صلاحیت دی، مچھلی کو تیرنے کی۔ ہاتھی کو چلنے کی، ہرن کو تیز رفتار بھاگنے کی، سانپ کو زمین کے اندر رہنے کی، اور پرندوں کو گھونسلے بنانے کی۔ یہ وہ صلاحیتیں ہیں جن کے طفیل وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ انسان کو بھی اللہ نے بے شمار

صلاحیتیں دی ہیں لیکن وہ ایک جیسی نہیں ہیں ان کی مقدار میں فرق ہے۔

کسی کو لیڈر شپ کی صلاحیت دی تو اس کے لیے امدادی صلاحیتیں جیسے خود اعتمادی، بول چال کا ہنر اور بہادری جیسی نعمتوں سے بھی نوازا۔ اب انسان اگر اپنی یہ صلاحیت پہچان لے تو بہت آگے تک جا سکتا ہے۔ لیکن اگر وہی انسان جس میں اللہ نے بلند صلاحیت لیڈر شپ کی رکھی ہے اور وہ اپنا وقت معمولی نوکری کر کے گزار رہا ہے تو وہ زندگی بھر مطمئن نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ہاتھی کو تیراکی پر، چڑیا کو چلنے پر اور مچھلی چھپانے پر لگا دیا جائے۔ ان سے نتائج کی توقع کی جائے۔

اکثر لوگوں کے لیے سب سے مشکل مرحلہ اپنی ذہانت کو پہچاننا ہی ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے آپ چند چیزیں مدنظر رکھ سکتے ہیں۔

آپ میں جو صلاحیت ٹاپ پر ہوگی اُس شعبہ کے لوگ آپ کو بہت اٹریکٹ کریں گے۔ آپ جب بھی اپنی صلاحتوں کے معیار کا کام کریں گے تو آپ کو اپنے کام میں مزہ آئے گا۔ آپ کو اپنی ذہانت کے مطابق کام کرنے میں وقت کا احساس نہیں ہوگا۔ آپ ایسے کام میں بوریت کا شکار نہیں ہوں گے۔ آپ کو اپنی ذہانت والے کام میں تھوڑی محنت کے باوجود بہتر نتائج ملیں گے۔

اگر آپ پھر بھی اپنی ذہانت کی گہرائی تک پہنچنے میں ناکام ہیں تو انٹرنیٹ پر موجود مختلف ٹیسٹ دے کر بھی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ 1983 میں امریکن سائیکالوجسٹ ہاورڈ گارڈنر نے ذہانت کی 9 اقسام بیان کیں۔

| | |
|---|---|
| نیچر سے دلچسپی | Naturalist Nature Smart |
| زبان دانی کی ذہانت | Linguistic Word Smart |
| نمبروں کی ذہانت | Logical-Mathematical Number Smart |
| بات کو سمجھانے کی ذہانت | Vocals Sound Smart |
| دیکھنے کی ذہانت | Spatial Picture Smart |
| تعلق بنانے کی ذہانت | Interpersonal People Smart |
| اپنے آپ کو جاننے کی ذہانت | Intra-personalSelf Smart |
| نقشوں کو جاننے کی ذہانت | Maping Map Smart |
| محسوس کرنے کی ذہانت | Bodily-kinesthetic Body Smart |

ان میں سے جو بھی ذہانت کی قسم آپ میں زیادہ ہوگی آپ اُسی شعبہ میں تیزی سے کامیاب ہوں گے۔ ان ذہانتوں سے متعلق مخصوص شعبے بھی آپ کو آرام سے مل جائیں گے۔ آپ کو بس تھوڑی سے کوشش کرنی ہے۔

آپ اپنی ذہانت پر کام کریں۔ اپنی ذات پر غور کریں۔ وہ کون سے شعبے ہیں جو آپ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ کون سے لوگ ہیں جن کی گفتگو میں آپ کھو جاتے ہیں۔ جن کے پاس آپ بیٹھنا اور جن کو سننا آپ پسند کرتے ہیں۔ کون سے مضامین ہیں جو آپ کو بور نہیں کرتے۔ کون سے کام ہیں جن میں آپ وقت کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھیں ہمیں وہی شعبے سب سے زیادہ اٹریکٹ کر رہے ہوتے ہیں جن سے متعلقہ خوبیاں ہماری ذات کے اندر ہوتی ہیں۔ اگر آپ کو حساب کتاب کے کام آسان لگتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اندر لاجیکل ذہانت موجود ہے۔ آپ اس میں بہت آگے تک

جا سکتے ہیں۔ اگر آپ کو لوگوں سے بات چیت کرنا نہیں قائل کرنا، اچھی طرح سے سمجھا پانا پسند ہے تو آپ ابلاغ کی ذہانت کے مالک ہیں۔ آپ اس پر زیادہ توجہ دے کر کمال کی کامیابی سمیٹ سکتے ہیں۔ آپ کو اگر محسوس ہوتا ہے کہ آپ بہت اچھے ابزرور ہیں۔ اپنے ماحول پر اور ہر چھوٹی بڑی چیزوں پر گہری نظر رکھتے ہیں تو آپ اچھے سائنسدان بن سکتے ہیں۔

اپنی ذہانت کو پہچاننے کے لیے آپ کو انٹرنیٹ پر بے شمار ٹیسٹ مل جائیں گے جو آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ خود سے گفتگو آپ کی خود شناسی میں مدد کرتی ہے۔ اپنے اندر توجہ دیں۔ اپنی سوچ کے معیار پر محنت کریں۔ آپ کی کامیابی میں سب سے زیادہ کمال آپ کی سوچ کا ہی ہوتا ہے جس کو خیال سے حقیقت میں ڈھالنے کی صلاحیت آپ کے پاس ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ کی سوچ پر ہی آپ کا مستقبل ہے اسے آزاد ہر گز نہ چھوڑیں ان پر بھرپور توجہ دیں۔

آپ جتنا زیادہ کام اپنی ذات پر کریں گے۔ آپ کے اندر اُتنا ہی نکھار پیدا ہوگا۔ اتنا ہی آپ کامیابی سے نزدیک تر ہوتے چلے جائیں گے۔ زندگی بہت بڑی نعمت ہے لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم پوری زندگی اکثر اپنی ذہانت کے متضاد کام میں گزار دیتے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف ہماری اپنی زندگی عذاب میں گزرتی ہے بلکہ ہم سے جڑے لوگ بھی اس سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ یاد رکھیں جس کام میں آپ کا دل نہیں لگتا وہ کام آپ کے لیے نہیں ہے نہ وہ کام کبھی آپ کو خوشی دے گا۔

آپ یہ نہ دیکھیں کہ آپ اس وقت کس مقام پر کھڑے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو وہاں محسوس کرنا شروع کریں جہاں آپ خود کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ جتنا بڑا مقصد آپ زندگی کا رکھیں گے قدرت آپ کو اُسے حاصل کرنے کی طاقت خود بخود مہیا کرے گی۔ آپ کو پھر فقط اُسے استعمال کرنا ہے۔ اور اُس سمت میں مسلسل جدوجہد کرنی ہے۔

یاد رکھیں جو قیمت اور اہمیت اصلی چیز کی ہوسکتی ہے وہ ہر گز کاپی کی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا کسی کی کاربن کاپی بننے کے بجائے اپنی اوریجنل شناخت پیدا کریں۔ فوٹو کاپی کبھی بھی اصلی کاغذات کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اپنے اندر کے جوہر کو پہچان کر میدان میں اتریں۔

آپ اس وقت چاہے جتنی مرضی ظاہری معمولی حالت میں ہیں۔ آپ کا اکیڈمک

ریکارڈ چاہے جتنا مرضی خراب رہا ہے۔ یاد رکھیں ہر شعبہ میں کامیابی کے لیے اکیڈمک کارکردگی ضروری نہیں ہے۔ بے شمار شعبے ایسے ہیں جن میں آپ اپنی محنت اور تجربے کی بنیاد پر بہت اوپر تک جاسکتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ آپ علی بابا کے بانی ''جیک ما'' کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ کے ایف سی جب چائنا میں شروع ہوا تو یہ ''جیک ما'' 24 افراد میں سے ریجیکٹ ہونے والا وہ واحد شخص تھا جسے ویٹر کی نوکری کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا تھا۔ زندگی میں بے شمار ناکامیاں دیکھنے والا یہ شخص ایک ایسی آن لائن کمپنی کی بنیاد رکھتا ہے جس کا شمار چند سالوں میں دنیا کی بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ آج وہی شخص نہ صرف چائنا کا امیر ترین آدمی ہے بلکہ اُس کا شمار دنیا کے 3 امیر ترین افراد میں ہوتا ہے۔ یہ سب کیسے ممکن ہو جاتا ہے؟ بے شمار لوگ اسے قسمت کا نام دیتے ہیں اور اُس محنت اور مستقل مزاجی کو بھول جاتے ہیں جو کسی کامیاب انسان نے بغیر رکے بغیر تھکے اور بغیر ہار مانے جاری رکھی ہوتی ہے۔

اسی ''جیک ما'' کا جب مزید ماضی دیکھتے ہیں تو یہ شخص دس دفعہ ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ کی کوشش کرتا ہے اور ہر دفعہ ناکام رہا۔ یہ شخص زندگی میں 30 جگہ نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کوئی بھی اسے معمولی نوکری دینے کو تیار نہیں۔ پرائمری امتحان میں دو دفعہ اور مڈل میں 3 دفعہ فیل ہونے والا شخص بھی یہی ''جیک ما'' تھا۔ پولیس میں پانچ دوستوں میں سے اکیلا سلیکٹ نہ ہونے والا بھی یہی جیک ما تھا۔ ''علی بابا'' شروع کرنے سے پہلے دو کاروبار میں بری طرح ناکامی بھی اسی شخص نے دیکھی تھی۔ لیکن نتائج آج دنیا کے سامنے ہیں۔ اگر یہ شخص بھی اتنی ناکامیاں دیکھنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتا تو کیا اتنی بڑی کامیابی ممکن تھی۔

مکتب کی چار کتابیں ہمیں وہ سبق نہیں دیتی جو ہم زندگی سے سیکھتے ہیں۔ آپ مت بھولیں کہ آپ یونیک ہیں۔ آپ جیسا اس پوری دنیا میں کوئی بھی دوسرا موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے خوابوں کو ہرگز مرنے نہ دیں۔ اپنے آئیڈیاز کو زندگی دیں۔ دنیا میں لاکھوں مثالیں ایسی ہیں جنھوں نے ناممکن کو ممکن کر کے دکھایا ہے۔

ناکامیاں کبھی بھی ہمت ہارنے کے لیے نہیں ہوتی یہ ہماری زندگی کا بہترین تجربہ ہوتی ہیں جس سے نا صرف ہم خود سیکھتے ہیں بلکہ ان تجربات سے دوسرے لوگ بھی فائدہ

اٹھاتے ہیں۔ ہم ان سے سبق لیتے ہیں کہ انہیں دہرانا نہیں ہے۔ کامیاب لوگ دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں

آپ کو بھی دوسروں کی زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں سبقت لینی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کامیاب اور ناکام لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں۔ اُن کی آپ بیتی اور کتابوں سے بھرپور فایدہ اُٹھایں۔ اگر آپ غور کریں تو یہ کتابیں لاکھوں کروڑوں تجربات پر مشتمل بہت قیمتی اثاثہ ہیں جو ہمیں بازار سے باآسانی دستیاب ہیں۔ لیکن ہمارا یہ المیہ رہا ہے کہ ہم علم دوست نہیں ہیں۔ ہم معیاری کتابوں سے دور ہیں اور فقط اپنے کورس کی کتابوں کو حرف آخر سمجھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کامیابی چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے مطالعہ کو بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ مطالعہ آپ کو نہ صرف اپنی زندگی سنوارنے میں بلکہ اپنے ساتھ بے شمار لوگوں کی زندگی سنوارنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

آج سے عہد کریں کہ روزانہ کی بنیاد پر اپنی زندگیوں میں بہتری لانی ہے۔ اپنی سوچ میں نکھار لانا ہے۔ اپنے آئیڈیاز کو عملی شکل دینی ہے۔ ہمیں نہ صرف اپنی سمت کا واضح تعین کرنا ہے بلکہ ایسے لاکھوں نوجوانوں کو بھی سمت کے تعین میں مدد کرنی ہے جو تعلیم کے باوجود مایوس ہیں اور انہیں مستقبل میں اندھیرے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

آپ آج سے عہد کریں کہ روزانہ کم از کم ایک ایسی نیکی جو بے لوث ہوگی جو کسی کے چہرے پر مسکراہٹ لائے گی ضرور کریں گے۔ عہد کریں ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے احتساب کا جس میں آپ جان سکیں کہ آپ کس قدر تیزی کے ساتھ بہتری کی طرف گامزن ہیں۔ آپ اگر روزانہ صرف پندرہ منٹ پرسنل ڈویلپمنٹ کی کتابوں کو دینا شروع کرلیں تو سال میں پندرہ کتابیں ختم کر سکتے ہیں۔ اور یہ کتابیں آپ کی زندگی بدل کر رکھ دیں گی۔

آئیں اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور محنت کریں۔ اور جب کامیاب ہو جائیں تو اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی کامیابی میں مدد دیں آپ کے تجربات بھی بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کریں گے۔ آپ کا لمحہ لمحہ قیمتی ہے اور اسے قیمتی چیزوں کی طرح استعمال کریں۔ اپنی زندگی کا اپنی نعمتوں کا حق تو آپ کبھی ادا نہیں کر سکتے لیکن آپ ان کے لیے دن رات شکر ضرور کر سکتے ہیں۔ بے شک اللہ شکر کرنے والوں کو

خوب نوازتا ہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ

یقیناً اگر تم شکر کرو گے تو بلاشبہ ضرور میں تمہیں زیادہ دوں گا (سورت ابراہیم آیت 7)

امید ہے ہر ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لیے یہ کتاب آپ کا حوصلہ ہمیشہ قائم رکھے گی اور آپ ہر اُس انسان کو اس کتاب کا تحفہ ضرور دیں گے جسے آپ کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو دنیاوی اور آخروی زندگی میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائیں۔

❀❀❀

# شکریہ

میرے والدین کا جن کی اعلی تربیت نے مجھے سر اٹھا کر جینا سیکھایا۔ اور زندگی کی ساری ضروریات کو ہر قسم کے حالات میں پورا کیا۔ میری فیملی اور بہن بھائیوں کا جن کی محبت ہمیشہ سے میرے لیے لازوال رہی۔ میرے اساتذہ کا جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ مجھے زندگی سے روشناس کروانے والے گرو قاسم علی شاہ صاحب جن سے ملاقات کے بعد میں نے زندگی کی ترجیحات کا تعین کیا۔ جن کی نوجوان نسل کے لیے جاری کوششوں کو الفاظ کے احاطہ میں لانا ممکن ہی نہیں۔ میرے استاد قیصر عباس صاحب جنہوں نے مجھے کو چنگ کے علم سے روشناس کروایا۔ محترم عاطف مرزا صاحب کا جنہوں نے نہ صرف کتابوں سے محبت سکھائی بلکہ کتاب لکھنے کے لیے حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔ علی عباس صاحب کا جنہوں نے رشتے جوڑنے سیکھائے۔ اختر عباس صاحب کا جنہوں نے علم بانٹنا سیکھایا۔ ڈیل کارنیگی کا جن کی پہلی کتاب میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔

میرے تمام دوستوں خصوصی طور پر ڈاکٹر محمد سعید، عرفان انور، محمد منیر، محمد راشد، محمد حفیظ، ثاقب افضل، عبدالباسط، حافظ علی محسن، جبران حسین، فیصل رحمان، شاہد کیانی، سید تقی شاہ صاحب اور ان تمام کولیگز اور پیارے رشتوں کا جنہوں نے ہمیشہ مجھے محبتیں ہی دیں اور محبتیں بانٹنا سیکھایا۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

عبدالعزیز چوہدری

❀❀❀

# کوچنگ

عبد العزیز چوہدری ایک Certified Success Coach اور Certified Trainer ہیں۔موٹی ویشنل سپیکر کے طور پر آپ مختلف شہروں میں والدین، طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ سیشن کر چکے ہیں۔آپ نے پرسنل ڈویلپمنٹ پر ''سکول آف لیڈر شپ کراچی''، ''قاسم علی شاہ فاونڈیشن'' اور ''Possibilities'' جیسے بڑے اداروں سے ٹریننگ حاصل کر رکھی ہے اور مائینڈ سائینسز کے مختلف کورسز انٹرنیشنل یونیورسٹیز سے کر رکھے ہیں۔

کوچنگ کے حوالے سے آپ کیریر کونسلنگ، پبلک سپیکنگ فیئر، ریلیشن شپ مینجمنٹ، سٹریس مینجمنٹ، برنس مینجمنٹ، اینگر مینجمنٹ، فیملی پراہلمز، پرسنل ڈویلپمنٹ، میموری اینڈ فوکس، ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، بچوں کی مثالی تربیت، پرسنل گرومنگ، سپیشل نیڈز چلڈرن، سیلف موٹیویشن، پوزیٹوٹی اور رویوں پر کنٹرول، جیسے بے شمار ٹاپکس پر کامیاب کوچنگ کر چکے ہیں۔

عبدالعزیز چوہدری سے اپنے سکول میں بچوں، والدین یا اساتذہ کے لیے سیشن لینے یا ون ٹو ون ملاقات کرنے کے لیے رابطہ کیجیے۔

**Caring Hands Pakistan**
Office No 8,Fifth Floor, Barkat Market, Lahore
Ph: 0092-333-2372102,0092-345-9124990
makasher1982gmail.com

# ڈاکٹر عبدالعزیز چوہدری | ایک تعارف

عبدالعزیز چوہدری ایک Certified Success Coach اور Certified Trainer ہیں۔گذشتہ بارہ سالوں سے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔انسانی مزاج اور رویوں کے بارے میں آپ کے مختلف ریسرچ پیپرز شائع ہو چکے ہیں۔آپ کے کالم مختلف اخباروں جیسے "روزنامہ نئی بات"، "روزنامہ صدائے چنار" اور "روزنامہ اوصاف" میں آتے رہتے ہیں۔آپ مختلف ریڈیو چینلز پر انٹرویوز دے چکے ہیں، اور "ایف ایم"898. کے پروگرام "Map Your"Future" میں نوجوانوں کے مستقبل کے حوالے سے رہنمائی کرتے ہیں۔آپ نہ صرف Caring Hands Pakistan تنظیم کے بانی ہیں بلکہ مختلف سماجی تنظیموں کے ایگزیکٹیو ممبر ہیں جو کہ خصوصی افراد کی خود مختار زندگی کے لیے پاکستان اور کشمیر میں کام کر رہی ہیں۔آپ پاکستان کے تمام صوبوں کی بیشتر یونیورسٹیز میں عالمی کانفرنسز میں موٹیویشن پر کی گئی اپنی ریسرچز پیش کر چکے ہیں۔موٹیویشنل سپیکر کے طور پر آپ مختلف شہروں میں والدین، طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ سیشن کر چکے ہیں۔آپ نے پرسنل ڈویلپمنٹ پر "سکول آف لیڈر شپ کراچی"، "قاسم علی شاہ فاونڈیشن" اور "Possibilities" جیسے بڑے اداروں سے ٹریننگ حاصل کر رکھی ہے اور مائنڈ سائنسز کے مختلف کورسز انٹرنیشنل یونیورسٹیز سے کر رکھے ہیں۔

کوچنگ کے حوالے سے آپ کیریر کونسلنگ، پبلک سپیکنگ فیئر، ریلیشن شپ مینجمنٹ، سٹریس مینجمنٹ، بزنس مینجمنٹ، اینگر مینجمنٹ، فیملی پرابلمز، پرسنل ڈویلپمنٹ، میموری اینڈ فوکس، ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، بچوں کی مثالی تربیت، پرسنل گرومنگ، سپیشل نیڈز چلڈرن، سیلف موٹیویشن، پوزیٹوٹی اور رویوں پر کنٹرول، جیسے بے شمار ٹاپکس پر کامیاب کوچنگ کر چکے ہیں۔آج کل کوچنگ اور کونسلنگ کے ذریعے نوجوان نسل کی رہنمائی میں پیش پیش ہیں۔آپ کا فوکس نوجوانوں کی ایسی تعلیم و تربیت ہے جو اُن کی ذہانت اور شوق کے ساتھ جڑی ہوئی ہو۔اس مقصد کے لیے آپ سکولز میں خصوصی کیمپ منعقد کرتے ہیں تاکہ نوجوانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی ممکن ہو سکے۔ان کے بارے میں مزید جاننے اور سیکھنے کے لیے آپ درج ذیل لنکس چیک کر سکتے ہیں۔

f M/.. facebook.com

# ناممکن سے ممکن کا سفر | نابغۂ روزگار شخصیات کی نظر میں

## سید قاسم علی شاہ (مصنف، استاد، سپیکر)

"پرندہ پروں سے نہیں اڑتا بلکہ یقین سے اڑتا ہے" یہ وہ تحریک پیدا کرنے والا جملہ ہے جو اس کتاب کی ہر کہانی کو پڑھنے کے بعد خیال میں آجاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز چوہدری کی تلاش، جستجو اور شوق کا ثبوت یہ کتاب خود ہے۔ انھوں نے جس انتھک محنت سے یہ کتاب لکھی ہے کتاب کی اثر پذیری (تاثیر) بتاتی ہے کہ یہ غیر معمولی کام ہے۔ دنیا کا کوئی بھی لکھاری اگر اپنی تحریر کے ذریعے اپنے قاری میں اگر یہ یقین پیدا کر دیتا ہے کہ "تم کر سکتے ہو" تو یہ لکھاری کا قاری پر احسان ہوتا ہے۔ کیونکہ یقین بہت بڑی دولت ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی کتاب یقین کی دولت سے مالا مال ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ بھی علم میں آیا کہ اپاہج ہاتھ، پاؤں یا بازوؤں سے نہیں ہوتا بلکہ "سوچ" اپاہج ہو تو انسان کا سارا وجود اپاہج بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی کوشش کو قبول کرے آمین۔

## عاطف مرزا (مصنف، ٹرینر، سپیکر)

"جرأت ہو موسیٰ کی تو فضا تنگ نہیں ہے" اس کتاب کی ہر کہانی دراصل "بڑی سوچ" کی کہانی ہے۔ یہ کتاب آپ کے اندر بھی "بڑی سوچ" پیدا کرتی ہے۔ کم وسائل کے باوجود آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ ہر چیلنج اور ہر مشکل کا سامنا کیا جا سکتا ہے۔ ہر معذوری کو شکست دی جا سکتی ہے۔ آپ جیسے ہی بے شمار لوگ کامیابی کی داستانیں رقم کر چکے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ اپنے اندر بڑی سوچ پیدا ہونے دیں۔ وہ سوچ جو آپ کو اپنی ذات سے اوپر لے جائے۔ جو آپ کو کسی مقصد، مشن اور انسانوں کی خدمت کے جذبے سے جوڑ دے۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر عبدالعزیز کی یہ تحریر امید کی ایک تحریک بن جائے آمین۔

## ڈاکٹر محمد سعید (پی۔ایچ۔ڈی)

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے زمانہ حال اور ماضی قریب سے ایسی زندہ اور لافانی مثالیں جمع کر کے پیش کی ہیں کہ جن کو پڑھنے کے بعد انسان اپنے اندر کی سستی اور کاہلی کو ترک کر کے میدان عمل میں اتر کر قدم رکھ کر محنت کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب ایک ایسا اصول، تھامنے اور گوہر نایاب ثابت ہوگی جس کی نظیر دور حاضر اور دوران طریق پیش کرنے سے قاصر ہے۔

## حافظ علی محسن (پرنسپل این۔ایس۔ای۔سی۔لاہور)

یہ کتاب نہ صرف دنیا بھر کے خصوصی افراد کو خراج تحسین کے طور پر جانی جائے گی بلکہ یہ کتاب چوہدری صاحب کی شب و روز کی محنت اور محسن کی علامت بن کر رہے گی۔ میری خواہش ہے کہ یہ کتاب ہر گھر، دفتر اور لائبریری کی زینت بنے اور ہر طبقہ زندگی سے متعلق افراد اس سے استفادہ کریں اور اپنی زندگیوں میں کامیابی و کامرانی کی منازل طے کریں۔

## عبدالباسط رانا (پی۔ایچ۔ڈی سکالر)

ناممکن سے ممکن کا سفر ڈاکٹر صاحب کی عمدہ کوشش ہے جس سے اساتذہ، والدین اور طلبا بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اپنی اور اپنے بچوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو ابھار سکتے ہیں۔ نوجوانوں کے لیے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کی اس کوشش کو چار چاند لگائے اور انہیں تعلیم، تحقیق اور ادب کے میدان میں مزید کامرانیاں عطا فرمائے آمین۔


نئی سوچ

آفس نمبر 46-47، فرسٹ فلور،
بادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

Ph: 042-37361416
Cell: 0300-8475843

ISBN 9789697879090
Rs.500.00